ناول "کئی چاند تھے سر آسماں" کے بین السطور "مہاساخت" لفظیات کی نشاندہی

ارم بتول، شعبہ اردو، فاطمہ جناح ویمن یونی ورسٹی راولپنڈی

ڈاکٹر فرحت جبیں ورک، چیئر پرسن، شعبہ اردو، فاطمہ جناح ویمن یونی ورسٹی راولپنڈی

ABSTRACT:

In order to adapt the novel Kai Chaanad Thay Sar-e-Asman (The Mirror of Beauty) to the requirements of the modern era, its Vocabulary has- been thoroughly reviewed so that vocabulary can Come out with its inner making along with all the necessary references. Both dictionary and Special dictionary are used in different meanings in urdu Because the Principles of Compiling special dictionary are from the Principles of lexicography. Very different Special Dictionary includes vocabulary, compounds, terms, idioms. Related to a particular language or a particular aspect of science or art and their respective meanings are included. The Purpose of a Special Dictionary of literary texts is to analyze the words of writer or Post, especially the words of classical texts in Social, historical and cultural terms. Cultural change changes the meaning of any words. Therefore, it is important to take into account the specific words of the author while compiling special dictionary. A special dictionary gives the corresponding meaning of word as intended by the author. Another important purpose of special Dictionary is to preserve our ancient literary heritage by - translating words from ancient classical texts into "language so that easily these texts can be understood by a common reader. It is an established Principle of linguistics that language changes over change some class terms time and words change. This linguistic change comes in regional, geographical, social and class terms. Many meanings of a word are used included in the dictionary, but Special dictionary include only those meanings. Come from the Poet or writer's Phrase.

کسی بھی زبان اور ادب سے اگر ناول کو نکال دیا جائے اور پھر اس ادب کے سرمایہ پہ نظر دوڑائی جائے تو یقیناً اس ادب میں ایک بہت بڑی کمی محسوس ہو گی۔ یہی حال اُردو زبان و ادب کا بھی ہے اگر اُردو ادب میں سے ناولوں کو نکالا جائے تو ہمارا ادب یقیناً ایک بہت بڑے جزو سے خالی نظر آئے گا۔ ۱۸۶۹ء میں مولوی نذیر احمد نے اُردو ادب کو ایک نئی صنف سے متعارف کروایا اور یہ صنف کامیابی کی منازل طے کرتی ہوئی امر بیل کی مانند منڈیر پر جا پہنچی۔

۲۰۰۶ء میں ادبی دنیا کی سرزمین پہ نمودار ہونے والا ناول ''کئی چاند تھے سر آسماں'' آج ۲۰۲۲ء میں بھی ادبی دنیا کے آسمان پر اپنے جلوے بکھیر رہا ہے۔ اس ناول کے اب تک چھ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اس ناول کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ مستقبل قریب ہی میں یہ ہمیں فلمی دنیا میں بھی مقبولیت کے جھنڈے گاڑھتا ہوا نظر آئے گا۔ اس کے علاوہ یہ ناول ہندوستان میں بھی شائع ہوا۔ اس ناول کا ہندی ترجمہ بھی شائع ہوا اور ۲۰۱۳ء میں اس ناول کا انگریزی ترجمہ بھی شائع ہوا۔ دوسرے ناولوں کے برعکس یہ ناول مختلف ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔

۷۲ ابواب میں کرداروں کا ایک جنگل موجود ہے مگر ناول نگار نے اس انداز میں کہانی کو آگے بڑھایا ہے کہ اگر ایک کردار بھی ذہن سے محو ہو تو کہانی میں خلا نظر آنے لگے گا۔ ناول نگار نے ۷۵۶ صفحات میں ادب اور تاریخ کا ایک حسین مرقع پیش کیا ہے جس کی بدولت شمس الرحمن فاروقی صاحب کے ایک بہترین ناول نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہترین مورخ ہونے کا علم بھی ہوتا ہے۔ یا ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ فاروقی صاحب جو کہ ایک مورخ بھی ہیں ان کی زندگی بھر کی تحقیق کا نچوڑ اس ناول میں نظر آتا ہے۔

اس ناول میں اس دور کا ذکر ہے جب برصغیر پاک و ہند میں دو تہذیبیں آپس میں مل رہی تھیں جن میں سے ایک مشرقی یعنی ہندوستانی تہذیب اور دوسری مغربی یعنی انگریزی تہذیب۔ اس ناول میں فاروقی صاحب نے دونوں تہذیبوں کا ملاپ احسن طریقے سے دکھایا ہے کہ قاری اس ملاپ کو ناول کی رنگینی میں بہہ کر پڑھتا ہوا آگے گزر جاتا ہے لیکن نوآبادیاتی عہد کی حقیقتیں اس کے لاشعور میں رہ جاتی ہیں۔ یہ ناول ایسا ہی ہے کہ قاری اس کے آغاز کے چند صفحات پڑھنے کے بعد دنیا و مافیا سے بے خبر کسی پُر سکون گوشے میں بیٹھ کے اس کو پڑھ ڈالتا ہے۔ اس ناول کے متعلق یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ کہانی ہے وزیر خانم کی جو کہ داغ دہلوی کی والدہ ہیں۔ اس ناول کی تمام کہانی انہی کے کردار کے گرد متعلق گھومتی ہے ان کی زندگی میں چار مرد آئے۔ پہلے دو مردوں کے ساتھ یہ بغیر نکاح کے رہیں جبکہ تیسرے اور چوتھے مرد کے ساتھ خانگی زندگی بسر کی۔ پہلا مرد مارسٹن بلیک بلوے میں مارا گیا، دوسرے نواب شمس الدین پھانسی چڑھ گئے، تیسرے آغا مرزا تراب علی کو ٹھگوں نے مار دیا اور چوتھے مرزا فخر بہادر کو ہیضے کی وبا لے ڈوبی۔ بظاہر اس ناول کہ کہانی سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ کہانی محبت کی کہانی ہے جس میں محبت میں ملنے والے درد و غم اور راحتوں سے کہانی آگے بڑھ رہی ہے لیکن جب اس کے دامن میں جھانک کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ فاروقی صاحب نے ہند اسلامی تہذیب کو ماضی سے جوڑ کر ایک پوری تہذیب کی خوبیاں اور رنگینیاں واضح کر دی ہیں۔ اس ناول میں راجپوتانے سے کشمیر اور سونپور تک واقعات کو پھیلایا گیا ہے۔ اس ناول میں گو کہ کردار اصلی ہیں مگر ان کرداروں سے تخیل کی بنیاد پر ایسی کہانی تخلیق کرنا فاروقی صاحب کے سوا کسی کے بس کا کام نہ تھا۔

تاریخی اعتبار سے یہ ناول انیسویں صدی سے بھی بہت پہلے شروع ہو کر ۱۸۵۶ء میں ختم ہوتا ہے۔ اس پورے عرصے میں ناول نگار اپنے قارئین کو ایک ایسی دنیا کی سیر کرواتا ہے جہاں معاشرتی اور تہذیبی اقدار بہت مضبوط ہیں۔ ہر طرف زندگی کی چہل پہل ہے۔ یہاں ایک ایسا عہد بیان ہو رہا ہے جو کہ قابلِ فخر ہے مگر پھر زمانے کی بساط الٹتی ہے اور سماں بدل جاتا ہے پھر اسی ناول سے درپردہ حقیقتیں سامنے آتی ہیں کہ اس زمانے میں ہندوستانیوں کے ساتھ انگریزوں کا رویہ کیسا تھا اور انگریز اپنے قدم جمانے کے لیے کیسی کیسی حکمت عملیاں اختیار کر رہے تھے وغیرہ۔ اس طرح کے کئی اشارے ہمیں اس ناول میں ملتے ہیں۔ انگریزوں کے ان حالات سے برصغیر پر اور خاص دہلی پر کیا اثرات مرتب ہوئے ان کا اندازہ بھی اسی ناول سے ہوتا ہے۔ فاروقی صاحب جو کہ ایک مورخ بھی تھے انھوں نے کمال مہارت سے اپنی کی گئی تحقیق سے تاریخ کے پردے پر روشنی ڈالتے ہوئے تمام تاریخی حقائق کو بیان کیا ہے اور اس روانی سے بیان کیا کہ وہ واقعات واقعی تاریخ کی کڑیاں معلوم ہوتے ہیں۔

شمس الرحمن فاروقی نے اس ناول میں فنونِ لطیفہ کو بھی سمویا ہے اور اس ذیل میں موسیقی، فنِ مصوری، قالین بافی، نقاشی قابلِ ذکر ہیں۔ ناول نگار نے فنونِ لطیفہ کو واقعات کی دبیز چادر میں یوں سمویا ہے کہ اس سے ناول نگار کی اپنی قابلیت بھی منظر عام پر آتی ہے کہ وہ صرف اُردو ادب کا ہی باریک بین علم نہیں رکھتے تھے بلکہ دیگر موضوعات کی بھی جانچ پرکھ بھی رکھتے تھے۔ اس سے فاروقی صاحب کے ہر فن مولا ہونے میں کوئی شک باقی نہیں رہ جاتا۔

اکرام الحق اس ناول کے متعلق یوں رطب اللسان ہیں۔

> "شمس الرحمن فاروقی ہی "کئی چاند تھے سرِآسماں" جیسا بیانیہ لکھ سکتے تھے، جو نہ صرف بے عیب ہے بلکہ نہایت تفصیل کے ساتھ اور لطافت سے گھڑا گیا ہے۔ فاروقی نے مگرمچھوں کے اس تالاب میں گہرا اور پُراعتماد غوطہ لگا کر، جسے ہم میں سے اکثر انیسویں صدی کی دلی کے شب و روز سمجھتے ہیں، ہمیں ایک ایسی کہانی عطا کی ہے جو ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی سے کچھ پہلے کی دہائیوں کی ہو بہو عکاسی کرتی ہے"1

بہت سے ادیبوں اور ناقدین نے اس ناول پہ تبصرے اور تجزیے کیے ہیں جو کہ "خدا لگتی" کتاب میں شائع ہوئے ہیں۔ اس ناول کا مستقبل حال کی طرح روشن و تابناک ہو گا۔ امید کی جاسکتی ہے کہ کچھ سالوں بعد یہ ناول کلاسیک کی فہرست میں شمار کیا جائے گا۔ یقیناً آنے والی نسلوں کے لیے یہ ناول ایک صدی سے کچھ زیادہ عرصے کی تہذیبی دستاویز کا رتبہ پائے گا۔

پلاٹ

ناول کے اجزائے ترکیبی میں پلاٹ بہت اہمیت کا حامل ہے کیونکہ ناول کی مقبولیت کا انحصار ہی پلاٹ پر ہوتا ہے۔ ناول میں پلاٹ اور کہانی کا چولی دامن کا ساتھ ہے کیونکہ کہانی پلاٹ کے ساتھ ساتھ چلتی ہے اور پلاٹ کہانی کے گرد گھومتا ہے۔ یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ پلاٹ کہانی میں وقت کے اعتبار سے حالات و واقعات کو بیان کرتا ہے۔ ناول میں قصوں کو ترتیب دینے کا نام پلاٹ ہے۔ ایک کامیاب ناول نگار ناول میں واقعات کو ایسے ترتیب دیتا ہے جیسے موتی لڑی میں پروئے جاتے ہیں اور یہی ایک کامیاب ناول کا راز ہے، کیونکہ واقعات میں ربط اور تسلسل بہت ضروری ہے اور ایسا منطقی تسلسل ہونا چاہیے کہ ایک واقعہ کے بعد اگلا آنے والا واقعہ بالکل فطری معلوم ہو یعنی جب واقعات ایک دوسرے سے پوری طرح پیوست ہوں گے، تو ہی پلاٹ مربوط اور گٹھا ہوا کہلائے گا۔ پلاٹ ترتیب دینا فنِ تعمیر ہے۔ ناول نگار جس باریک بینی سے پلاٹ ترتیب دے گا ناول کی عمارت اتنی ہی شاندار اور کامیاب طریقے سے سامنے آئے گی۔ پلاٹ میں عموماً پانچ حصے ہوتے ہیں پہلے حصے میں کرداروں کا تعارف، دوسرے حصے میں کرداروں کے معاملات الجھنا شروع ہو جاتے ہیں۔ تیسرے حصے میں الجھے ہوئے معاملات کا سلجھنا محال لگتا ہے جبکہ چوتھے حصے میں معاملات سلجھنے لگتے ہیں اور پانچویں حصے میں معاملات خاتمہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ پلاٹ کی یہ ایک بہت سیدھی سی ترتیب ہے۔

علی عباس حسینی اپنی کتاب ''اُردو ناول کی تاریخ اور تنقید''میں پلاٹ سے متعلق یوں رقمطراز ہیں:

> "پلاٹ واقعات کے اس خاکے کو کہتے ہیں جو ناول نویس کے پیش نظر شروع ہی سے رہتا ہے۔ قصہ کی ساری دلچسپیاں اسی کی ترتیب پر مبنی ہیں۔ اسے جاننا چاہیے کہ وہ کیوں کر قصہ چھیڑے گا۔ ناظر کی دلچپسی کس کس طرح بڑھائے گا اور اس دلچپسی میں مدو جزر کہاں کہاں پیدا کرے گا۔ اسے قصہ اس طرح کہنا چاہیے کہ وہ موثر ہے اور اس مقصد و غرض کے حاصل کرنے میں کامیاب ہو جس کے لیے وہ ناظر کو زحمت دینا چاہتا ہے۔"2

اقتباس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ پلاٹ میں کہانی و واقعات نہایت سلیقہ اور خوبی کے ساتھ موجود ہونے چاہئیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ناول نگار کی توجہ کہانی پہ ہو کیونکہ اگر توجہ صرف پلاٹ پر ہی مزکور کی گئی تو پلاٹ ریاضی کا فارمولا بن کر رہ جائے گا کیونکہ ضرورت سے زیادہ گٹھا ہو پلاٹ میکانکی تصور کیا جاتا ہے اور اس میں آورد کی آمیزش شامل ہو جاتی ہے تو کہانی اس وقت گھڑی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ لہذا کسی ناول کا پلاٹ بہت گٹھا ہوا

ہونا کوئی خوبی کی بات نہیں بلکہ پلاٹ کو حقیقت کے قریب رہنا چاہیے یعنی پلاٹ ڈھیلا ڈھالا اور لچک دار نہ ہو بلکہ منظم اور مرتب ہو۔ پلاٹ کو اقسام کے لحاظ سے بھی یوں بھی تقسیم کیا جاتا ہے کہ ایک ایسی کہانی جس میں ایک ہی قصہ چل رہا ہو اور دوسری قسم جس میں ایک کہانی میں کئی قصے ساتھ ساتھ چل رہے ہوتے ہیں۔

پلاٹ کی اس ساری تفصیل کے تحت اگر ناول ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' کا جائزہ کیا جائے تو یقیناً یہ ناول تمام اجزائے ترکیبی اور خصوصاً پلاٹ کے حوالے سے شاندار ناول ہے۔ پلاٹ کی پہلی شرط کہ حالات و واقعات کو وقت کے اعتبار سے شاملِ ناول کیا جاتا ہے اس کی روشنی میں اگر ناول ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' کا جائزہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کی اس میں کوئی جھول نہیں ہے کیونکہ ناول میں تمام حالات و واقعات کو ایک مخصوص تسلسل سے پیش کیا گیا ہے۔ ناول کی کہانی کردار مخصوص اللہ سے شروع ہوتی ہے اور چھوٹی بیگم یعنی وزیر خانم کے دربار سے نکلنے پہ ختم ہوتی ہے۔ اس درمیان وزیر خانم کی زندگی میں آنے والے اتار چڑھاؤ کا بیان بخوبی شامل ہے۔ انگریزوں کی شمولیت ان کا مسلمانوں سے ناروا سلوک خود ہندوستانیوں کی غداریاں وغیرہ ان تمام واقعات کو ناول نگار نے اس خوش اسلوبی سے سمیٹا ہے کہ یہ ناول جس میں تین سے چار نسلوں پہ کہانی محیط ہے اس دوران کہیں بھی خلا محسوس نہیں ہوتا ہے۔ پلاٹ کی دوسری شرط پلاٹ گٹھا ہوا اور منطقی ہونا چاہیے اس حوالے سے اگر ناول ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' کا جائزہ لیا جائے تو بھی ناول کا پلاٹ سرائے جانے کے قابل ہے۔ ایک اتنا ضخیم ناول جو کہ تقریباً صدی پر محیط ہے اس ناول کا پلاٹ انتہائی عمدہ، گٹھا ہوا سلسلہ وار ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ناول نگار کی توجہ ناول لکھتے ہوئے کہانی کے ساتھ ساتھ پلاٹ پر بھی مرکوز تھی کیونکہ اگر صرف کہانی کو مدِ نظر رکھا جاتا تو پلاٹ نہ بن پاتا اور اگر صرف پلاٹ کو ہی اولیت دی جاتی تو شاید ایک فارمولا نما ناول سامنے آتا مگر ناول نگار نے دونوں چیزوں میں اعتدال رکھا جس کے نتیجے میں ایک شاندار ناول وجود میں آیا۔

ناول ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' کی کہانی میں ایک ساتھ کئی قصے چل رہے ہیں اور ان قصوں، حالات و واقعات کو نہایت سلیقے کے ساتھ سمویا گیا ہے۔ پلاٹ جس کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ واقعات کو یوں پیش کرے کہ آغاز، وسط اور انجام نمایاں ہو سکیں۔ اسی کے تحت اس ناول میں بھی تمام واقعات کو اسی طرح پرویا گیا ہے کہ واقعات سے آغاز، وسط اور انجام بخوبی ظاہر ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک کامیاب پلاٹ کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ پلاٹ مختلف حصوں میں ایسا تعمیری ربط ہونا چاہیے کہ اگر کسی ایک بھی کردار یا واقعہ کی جگہ بدلی جائے یا حذف کیا جائے تو پلاٹ میں واضح جھول محسوس ہو۔ ناول ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' کے پلاٹ میں تمام کردار اور واقعات میں انتہائی تعمیری ربط ہے اس کہانی میں اگر کسی ایک بھی کردار یا واقعہ کو ادھر اُدھر کیا جائے یا حذف کر دیا جائے تو یوں محسوس

ہوتا ہے کہ جیسے کسی سنگِ میل کو ہٹا دیا گیا ہو۔ کامیاب پلاٹ کی ایک اور خوبی کہ اس میں صرف انہی چیزوں کا بیان ہی شامل ہوتا ہے جن کا واقعہ ہونا لازمی ہو یا جو واقع ہو سکتی ہوں اس کی روشنی میں اگر ناول ''کئی چاند تھے سرآسماں'' کے پلاٹ کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس پلاٹ میں کسی قسم کے غیر فطری موضوعات کو بیان نہیں کیا گیا بلکہ برصغیر پاک وہند کے ماحول کے مطابق کہانی کو ڈھالا گیا ہے اور صرف انہی واقعات کو ہی شاملِ متن کیا گیا ہے جو فطری ہوں اور ہر طرح کے غیر فطری اور غیر یقینی واقعات کو بیان نہیں کیا گیا۔ اس کے باعث جب قارئین کہانی کو پڑھتے ہیں تو انھیں یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے وہ اس دور میں جی رہے ہوں۔ بہت سے ادبا اور ناقدین کا کہنا ہے کہ جب ہم اس ناول کو پڑھتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم اکیسویں صدی میں نہیں بلکہ اٹھارویں یا انیسویں صدی میں جی رہے ہوں۔

پلاٹ کے حوالے سے فاروقی صاحب خود اپنی کتاب میں یوں رقمطراز ہیں۔

> "پلاٹ کیا ہے؟'' کے جواب میں ارسطو کے پیرو کہتے ہیں کہ پلاٹ وہ شے ہے جس کے واقعات میں علت اور معلول کا ربط ہو۔ لہذا ہر وہ شے جس میں علت اور معلول کا ربط نہ ہو، پلاٹ کی تعریف سے خارج ہو جاتی ہے۔"3

اس اقتباس کی روشنی سے بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ناول ''کئی چاند تھے سرآسماں'' کا پلاٹ بلاشبہ ایک شاندار اور عمدہ پلاٹ ہے اور یہ پلاٹ کے متعین کیے گئے تمام اصولوں پر پورا اترتا ہے۔

ساخت

ساخت جو کہ انگریزی زبان کے لفظ structure سے ماخوذ ہے، اس کو ساختیات یعنی structuralism کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ ساختیات ایک لسانی اصطلاح ہے جس کا بانی سوئس ماہرِ لسانیات سوسیئر کو مانا جاتا ہے۔ ساختیات کا دامن بہت وسیع ہے ساختیات میں نہ صرف زبان کی ساخت سے متعلقہ بات ہوتی ہے بلکہ یہ متن میں لفظ اور معنی کے رشتے سے بھی روشناس کرواتی ہے۔ دراصل ساختیات ادراک کا علم ہے کہ قاری کسی بھی ادبی فن پارے کو پڑھ کر اس سے کیا نتیجہ اخذ کرتا ہے۔ ساختیات میں صرف ادبی اظہار ہی نہیں بلکہ اساطیر، دیومالا، قدیم روایتیں، عقائد، رسم ورواج، طور طریقے، تمام ثقافتی معاشرتی مظاہر مثلاً لباس و پوشاک، رہن سہن، خور دونوش، بود وباش، نشت و برخاست وغیرہ بھی شامل ہیں یعنی ہر وہ نقطہ جس کی بدولت حقیقت سامنے آسکے اور مخفی معنی ظاہر ہو سکیں وہ ساختیات کا حصہ ہے۔ زبان کے مطالعہ کے حوالے سے سوسیئر اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں۔

"زبان کا مطالعہ فقط اس کے اجزا کو لے کر یا محض تاریخی اعتبار سے نہیں کرنا چاہیے (جیسا کہ اس وقت عام رواج تھا) بلکہ ان رشتوں کی رو سے کرنا چاہیے جن کی وجہ سے زبان کے اجزا باہم گر ربط رکھتے ہیں، اور عمل آرا ہوتے ہیں۔ یعنی زبان کا مطالعہ ایک مربوط وحدانی نظام کے طور پر کرنا چاہیے۔"4

سوسیئر نے زبان کے تصور کے حوالے سے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک langue اور دوسرا parole، لانگ سے مراد کسی زبان کا تجریدی نظام ہے یعنی جس کی رو سے زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے اور پارول سے مراد زبان کا فی الوقعہ استعمال یا تکلم ہے جو کہ زبان بولنے والے پر منحصر ہے۔

ساختیات کی اس بحث کے بعد اگر ناول ''کئی چاند تھے سر آسماں'' کا ساختیاتی جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ ناول جو کہ بظاہر ایک عورت یعنی وزیر خانم کے کردار کے گرد گھومتا ہے در حقیقت اس میں کئی معنی پوشیدہ ہیں۔ چونکہ اس ناول میں اُس وقت کو بیان کیا گیا ہے جب دو تہذیبیں آمنے سامنے تھیں اور مشرقی تہذیب کا دیا مغربی تہذیب کے جھونکوں سے بجھ رہا تھا۔ ایسے وقت میں غالب قوم کا اقتدار اور ان کا ہندوستانیوں کو ہیچ سمجھ کر تضحیک آمیز رویہ بہت سی حقیقتیں بیان کر رہا ہے۔ اس ناول میں وزیر خانم کی زندگی میں داخل ہونے والے دوسرے مرد نواب شمس کو ولیم فریزر کے قتل کے جرم میں پھانسی پر چڑھا دیا گیا جبکہ یہ قتل نواب شمس الدین نے کیا بھی نہیں تھا۔ بلکہ بات کچھ یوں تھی کہ انگریز افسران بالا کو نواب شمس الدین کا وجود کھٹکتا تھا اور وہ ان کی زمینوں پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔ اسی طرح کی کئی مثالیں اس ناول میں موجود ہیں۔ اسی ناول سے ایک مثال درج ذیل ہے۔

"عام طور پر نکاح یا شادی کی کوئی اسلامی یا عیسائی رسم کسی بی بی کے ساتھ ادا نہ ہوئی تھی۔ بہت سے بہت یہ تھا کہ کسی عورت کو بی بی بنانے کے پہلے یا فوراً بعد اپنے افسر بالا کو تحریری (اور اکثر زبانی) اطلاع دی جاتی تھی کہ میں فلانی کو اپنی بی بی بنا رہا ہوں۔"5

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انگریز مسلمانوں کے ساتھ کس طرح کا برتاؤ کرتے تھے یعنی مسلمان عورتوں کی ان کی نظر میں کوئی اہمیت نہ تھی جس وقت جو بھی پسند آجاتی اس کو بغیر نکاح کے اپنے حرم میں داخل کر لیتے ۔ چاہیے اس سے اولاد بھی ہو جاتی مگر اس کو کبھی بھی بیوی یا منکوحہ کا درجہ نہ دیا جاتا اور اگر کوئی انگریز مرد اپنے نکاح کا اعلان بھی کرتا تو بھی اس کے اعلان کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی وزیر خانم کی زندگی میں شامل ہونے والا پہلا مرد مارسٹن بلیک اس نے بھی وزیر خانم سے نکاح نہیں کیا اس سے وزیر خانم کی دو اولادیں ہوئیں گو کہ وزیر خانم نے ان کے اسلامی نام رکھے مگر ان کے حقیقی نام انگریزی نام ہی تھے۔ اسی طرح جب مارسٹن بلیک مر گیا تو اس کے بعد اُس کے خاندان

والوں نے وزیر خانم سے دونوں بچے لے لیے کیونکہ ان کے خیال میں بچوں کی صحیح پرورش انگریزی ماحول میں ہی ممکن تھی۔ اس کے علاوہ ناول میں جگہ جگہ انگریز ہندوستانیوں کو حرامی، بدذات، بد تہذیب وغیرہ کہہ کر مخاطب کرتے ہیں اگر ساختیاتی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ قاری جن سطروں یا الفاظ کو محض معمولی طنزیہ الفاظ کے پڑھ جاتا ہے جب ان کی گہرائی میں جائے تو معلوم ہو گا کہ ان الفاظ سے انگریزوں کی ذہنیت مکمل طور پر واضح ہوتی ہے۔ گو کہ یہ ناول بظاہر مرزا داغ دہلوی کی والدہ کی زندگی کے نشیب و فراز پر مشتمل ہے مگر جب اس ناول کا جائزہ ساختیاتی نقطہ نظر سے لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ شمس الرحمن فاروقی صاحب نے اس ناول میں تمام جزئیات کے ساتھ انگریز مسلم رویہ کو بیان کیا ہے جو کہ بظاہر معلوم نہیں ہوتا ہے لیکن اس ناول کی گہرائی میں منہ بولتے ثبوت موجود ہیں۔ ناول "کئی چاند تھے سرِ آسماں" جو کہ تاریخی ناول ہونے کے ساتھ رومانوی ناول بھی ہے مگر جب اس ناول کی ساخت پر سوال اٹھے تو اس کے جواب میں معلوم ہوتا ہے کہ یہ ناول سراسر تاریخی ہے جس میں تاریخ کو ایک تسلسل کے ساتھ جوڑ کر اس میں انگریزوں کا مسلمانوں کے ساتھ رویہ، مسلمانوں کا انگریزوں سے دبنا اور مسلمانوں کی غداریاں وغیرہ سے پردہ اٹھایا گیا ہے اور اس ضمن میں زبان اور فکر کے رشتے کو ملحوظ رکھا گیا ہے تا کہ اس ناول کی مکمل ساخت سامنے آسکے۔

ساختیات جو کہ حقیقت کے ادراک کا علم ہے یعنی مصنف نے اپنے ادبی فن پارے میں جو نکات مخفی رکھے ہیں ان کو تلاشنا، یا قاری اپنی سوچ کے مطابق ایسا مفہوم سامنے لے کر آئے جو کہ ادبی فن پارے کے مطابق ہو اور مراد لیا جا سکتا ہو تو ان حقیقتوں کو ساختیات کا نام دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ ناول ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' بظاہر رومانوی اور تاریخی ہے لیکن اس ناول میں تاریخ کے جھڑوکے سے ایسی حقیقتیں مراد لی جاسکتی ہیں جو کہ درپردہ اپنے حقائق بیان کر رہی ہیں۔ لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے ناول ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' کا ساختیاتی مطالعہ بہت سی ایسی حقیقتیں سامنے لاتا ہے جو کہ شاہد تاریخ کی دقیق کتابوں سے بھی سامنے نہ آسکیں اور ایک کامیاب فن پارے کی یہی خصوصیت ہے کہ جب اس کا ساختیاتی مطالعہ کیا جائے تو کئی حقیقتوں کا ادراک ہو سکے اور یہ حقیقتیں زبان کے لیے سودمند ثابت ہوں۔

کرداری زبان/وجوہات

ناول ''کئی چاند تھے سر آسماں'' کی زبان تاریخی لحاظ سے بہت اہمیت کی حامل ہے۔ یہ ناول چونکہ تاریخی لحاظ سے اٹھارویں اور انیسویں صدی کے عرصے پر محیط ہے لہٰذا اس ناول میں اس دور کے مطابق ہی زبان استعمال کی گئی ہے۔ ناول میں اس دور کو بیان کیا گیا ہے جب مشرقی اور مغربی تہذیبیں آپس میں مل رہیں تھیں ناول میں استعمال ہونے والی زبانوں کی وجوہات میں یہ وجہ سب سے اہم ہے۔ بات اگر صرف ناول کی زبان تک کی جائے تو ناول نگار نے ایسی

زبان استعمال کی ہے جو قارئین کی سمجھ میں آجائے اس کی وجہ یہ ہے کہ ناول میں فصاحت وبلاغت کے اصولوں کا خیال رکھا گیا ہے۔فصاحت وبلاغت کے اصول کہ :

۱۔کلام میں تنافر نہ ہو

۲۔کلام میں غرابت نہ ہو

۳۔کلام تحقید سے پاک ہو

فصاحت وبلاغت ادب کی ایک ایسی اصطلاح ہے جو شعر اور نثر دونوں میں استعمال ہوتی ہے۔یہ دونوں ہی مثبت خصوصیات ہیں۔فصاحت کا تعلق موزوں الفاظ سے جبکہ بلاغت کا تعلق موزوں معنی سے ہے۔کسی بھی کلام میں فصاحت اور بلاغت کی موجودگی اس کلام میں خوبصورتی کی غماز ہے۔بعض اوقات معنی کو متن میں اس طرح رکھا جاتا ہے کہ وہ قاری کی فہم سے دور چلا جاتا ہے اور یہی وہ نقطہ ہے جہاں آکے متن بلاغت کے درجے سے گر جاتا ہے۔عابد علی عابد نے فصاحت وبلاغت کو "مطابقت الفاظ و معنی" کے نام سے جانا ہے اور ان میں فصاحت و بلاغت کی پوری اصطلاح سمٹ جاتی ہے۔

اگر ہم فصاحت وبلاغت کے اصولوں کی کی روشنی میں ناول کی کرداری زبان کا جائزہ لیں تو اس اصطلاح کے مطابق کہ

۱۔کردار کس زبان میں بات کر رہا ہے اور ادب پارے کے الفاظ کو کردار سے منسلک ہونا چاہیے،اس کی روشنی میں اگر ناول "کئی چاند تھے سرآسماں" کی کرداری زبان کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس ناول کے کرداروں کی زبان ان کے کردار سے مکمل طور پر ملتی ہے یعنی کہ ناول میں کسی کردار کا جو مقام ہے وہ اسی کے مطابق ہی زبان بول رہا ہے۔کردار اور اس کی زبان میں کسی قسم کا کوئی خلاء نہیں ہے۔

۲۔کرداروں اور اس کے مکالموں میں مطابقت ہونی چاہیے۔اگر اس کے تحت ناول کی کرداری زبان کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ناول میں کردار کی جو حیثیت ہے وہ اسی کے مطابق مکالمے ادا کر رہا ہے۔اس ناول میں مسلمان اور انگریز یعنی دو قوموں کا ذکر کیا گیا ہے۔تو وہ کردار جو مسلمان ہیں وہ اس دور کے مطابق اردو زبان جس میں فارسی اور عربی کی آمیزش ہے بول رہے ہیں اور اگر کوئی کردار انگریزی زبان کے چند حروف بولتا بھی ہے تو وہ حروف اُردوائے گئے انگریزی حروف کہلاتے ہیں۔جبکہ وہ کردار جو انگریز نسل سے تعلق رکھتے ہیں ان کے مکالموں میں انگریزی زبان واضح ہے۔

۳۔قاری متن میں معنی کی اس اونچائی تک پہنچ جائے جو تحریر کرتے ہوئے خود مصنف کے ذہن میں تھی۔اس نقطہ نظر کے حوالے سے اگر ناول کی کرداری زبان کا جائزہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس ناول میں فصاحت وبلاغت کا بیان

واضح ہے یعنی اس ناول کی کہانی جو کہ ایک نسوانی کردار وزیر خانم کی زندگی کے نشیب و فراز پر مشتمل ہے۔ ناول کو پڑھ کر قاری ان کی زندگی کے واقعات پر تشویش یا مسرت کا اظہار نہیں کرتا بلکہ قاری اس خیال تک پہنچ جاتا ہے جو مصنف نے سوچا تھا یعنی تاریخ کو واضح کرنا، اس دور کی پوشیدہ حقیقتوں کو سامنے لانا اور دو تہذیبوں کے ٹکراؤ میں پسنے والی قوم کے محکومانہ حالات واضح کرنا۔ ان سب نقاط کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس ناول کی کرداری زبان میں فصاحت و بلاغت کا وجود خاصا پُر اثر ہے۔

اس ناول کے کرداروں کو اگر اقسام میں تقسیم کیا جائے تو تین طرح کے کردار سامنے آتے ہیں ایک وہ جو اس دور کی عربی اور فارسی آمیز اُردو بول رہے ہیں، دوسرے انگریز جنھوں نے اپنی زبان کو ترجیح دی اور ان کے مکالموں سے بھی رعونت ٹپکتی ہے اور تیسرے وہ کردار کہ جن کی زبان تو اُردو ہے مگر وہ اس میں انگریزی حروف بھی استعمال کرتے ہیں کیونکہ اس دور میں وہ انگریزی زبان انگریزوں کے توسط سے سن رہے تھے۔ ناول میں اُردو زبان بولنے والے کرداروں کی زبان کچھ یوں ہے۔

> "وزیر مہمان خانے پر اس شان سے پہنچی کہ اس کے داہیں بائیں دو مشعل بردار دستیاں روشن کیے ہوئے تھے، اس کے ذرا آگے ایک عصا بردار تھا اور ذرا پیچھے لیکن بائیں طرف کو ایک اور عصا بردار تھا۔ مہمان سرا کے دروازے پر مشعل بردار اور عصا بردار سلام کر کے رخصت ہوئے۔ مہمان سرا کیا تھی، اچھی خاصی محل سرا تھی، قدیم وضع کی۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس کے گرد کوئی چار دیواری نہ تھے اور نہ ہی سامنے کوئی چمن تھا۔"6

یہ زبان اُردو بولنے والے کرداروں کی تھی اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کردار جو اُردو بول رہے تھے ان کی اُردو زبان اس دور کے حالات کے مطابق بالکل خالص اور چاشنی گھلی ہے۔ اگر ناول میں انگریز کرداروں کی زبان کا جائزہ لیا جائے تو اس کی مثال کچھ یوں ہے۔

> "فریزر کے چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ اسی طرح برقرار تھی لیکن اب اس کا لہجہ پہلے کی طرح صاف نہ تھا بلکہ فرنگی انداز لیے ہوئے تھا۔ "اور دلاور الملک، جہانگیرہ بیگم اب کیسی ہیں؟ سنا تھا نصیبِ دشمناں ان کا مزاج ناساز ہے۔ جی چاہیے تو نور باغ میں جھولے ڈلوا دیے جائیں، وہاں تشریف لے آئیں، دل بہل جائے گا۔"7

یہ مکالمات انگریز کردار ولیم فریزر کے ہیں جو نواب شمس الدین سے ان کی بہن کے متعلق کہہ رہا ہے۔ ان مکالمات سے ظاہر ہوتا ہے کہ انگریز کردار جو کہ اس وقت کی حاکم قوم تھے ان کے الفاظ سے بھی حاکمیت کا رعب اور

رعونت ٹپکتی ہے۔اسی طرح تیسری قسم کے کردار جن کے جملوں میں انگریزی الفاظ بھی شامل ہونے لگے تھے ان کی مثال کچھ یوں ہے۔

"ادھر صاحب کو بی بی کی زبان سے انگریزی لفظوں کی ٹوٹی پھوٹی ادائیگی بھی بڑی پیاری لگتی تھی ۔وہ کرسمس کو ''کسمس'' کہتی ''شیمپین کو ''سمپن'' بولتی اور پارسلی کو ''پتر سیلی'' کہتی۔"8

اس اقتباس میں وزیر خانم اور مارسٹن بلیک سے متعلق بات ہو رہی ہے۔اس اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ وزیر خانم کا کردار جو کہ مکمل ہندوستانی کردار ہے وہ بھی انگریزی الفاظ کا دھیرے دھیرے استعمال اپنی زبان میں لا رہی ہیں،اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ناول میں تینوں قسم کے کردار ٹھوس وجوہات کی بنا پر اپنی زبان استعمال کر رہے ہیں یعنی جو اُردو بولنے والے کردار ہیں چونکہ اس دور میں علم و ادب کا دور دورہ تھا اور زبانیں خالص بولی جاتی تھیں تو اس کے نتیجے میں ہمیں صرف زبان میں ہی نہیں بلکہ کرداروں کی روزمرہ زندگی میں بھی وہی رکھ رکھاؤ نظر آتا ہے جو ہند اسلامی تہذیب کا خاصا تھا۔انگریز قوم جو کہ حاکم قوم تھی اس کی زبان انگریزی تھی اور اگر وہ اُردو بھی بولتے تھے تو ان کے الفاظ میں واضح حاکمیت کا رعب ہوتا ہے۔تیسرے وہ کردار جن کے الفاظ میں انگریزی، عربی اور فارسی الفاظ کی شمولیت تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ اُردو زبان کے علاوہ برصغیر میں یہ زبانیں بھی مقبول تھیں جس کی بدولت کرداروں کے الفاظ میں ان زبانوں سے بھی الفاظ در آئے۔پس اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ناول ''کئی چاند تھے سرآسماں'' کے کردار جو زبان استعمال کر رہے ہیں اس کے پیچھے تاریخی اعتبار سے ٹھوس وجوہات موجود ہیں۔

حالات

ناول ''کئی چاند تھے سرآسماں'' جو کہ تاریخی اعتبار سے اٹھارویں صدی سے بھی کہیں پہلے شروع ہو کر ۱۸۵۶ء تک کے عرصے پہ محیط ہے۔اس ناول میں ملکی، حکومتی، تہذیبی سطح پر ہونے والی تبدیلیوں کے نشیب و فراز کا بیان بخوبی شامل ہے۔اس ناول کی کہانی جو کہ مخصوص اللہ نامی کردار سے شروع ہوتی ہے وہاں سے لیکر شاہی قلعے کے حالات تک کو بخوبی بیان کیا گیا ہے۔آغاز میں ہندو مسلم رویہ سامنے آتا ہے چونکہ اس وقت وہ لوگ جو اقتدار میں تھے محض ان کا نام سنتے ہی گاؤں کانپ جاتے تھے یہی واقعہ بنی ٹھنی کی تصویر کا بھی ہے محض ایک تصویر جو کہ مہاراجہ کی بیٹی کی تھی اس کے گاؤں والوں کے سامنے آنے پر مہاراجہ نے پورا گاؤں خالی کروادیا۔اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ حاکم اور محکوم کا اس زمانے میں رشتہ کیسا تھا۔اس کے بعد جب وزیر خانم کے والد دہلی آکر قیام پذیر ہوئے تو ناول میں دہلوی تہذیب کی جزئیات کو بھی بیان کیا گیا ہے۔یہ وہ وقت تھا جب دہلی میں اکثر مسلمان گھرانوں میں بھی یہ رواج تھا کہ

لڑکی کا بے نکاحی کسی مرد کے گھر میں رہنا، طوائفوں کا ذکر بھی شاملِ متن ہے کہ ایک خوبصورت طوائف کے گھر کے باہر کس طرح آوارہ لڑکوں کی قطاریں لگی ہوتیں تھیں۔اسی زمانے میں شرفا گھرانوں کے رہن سہن کا بیان بھی شامل ہے کہ کس طرح شریف گھرانوں کی عورتیں پردے کی پابند تھیں۔اس کے ساتھ ساتھ انگریزوں کا ہندوستان میں داخل ہونااور اپنے قدم جمانا بھی دکھایا گیا ہے۔اس ناول میں انگریزوں کی ذہنیت کا ادراک اس وقت ہوتا ہے جب وزیر خانم کی زندگی میں مارسٹن بلیک آتا ہے۔اس کے بعد ناول میں ان حالات کا بیان شامل ہے جب انگریزوں کا سلوک ہندوستانیوں کے ساتھ ناروا ہونے لگا۔اس ضمن میں مارسٹن بلیک کا قتل سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ مارسٹن بلیک کو ہندوستانیوں نے جذبات میں آکر مار دیا تھااور یہی بات انگریزوں کی ہندوستانیوں سے دشمنی کو ہوا دے گئی اور اس کے بعد انگریزوں کے افسر ولیم فریزر کا جب قتل ہوا تو یہ واقعہ انگریز قوم کے دل میں ہندوستانیوں کے لیے کبھی ختم نہ ہونے والی نفرت کے نشان چھوڑ گیا۔اس کے بعد اگر تاریخ میں ہندوستان کے حالات کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جہاں بھی انگریز قوم کو موقع ملا انھوں نے اپنی نفرت کا عملی اظہار کیا۔

اس ناول میں وہ دور بھی بیان کیا گیا ہے جب دہلی پُر امن تھی تو وہاں کیسے شاعروں کی محفلیں جما کرتی تھیں۔اس ناول میں مقبول شاعر مرزا داغ دہلوی جو کہ وزیر خانم کے بیٹے ہیں ان کا بیان جگہ جگہ شامل ہے۔اس کے علاوہ اُردو ادب کے مشہور و مقبول شاعر مرزا اسد اللہ خان غالب، میر وغیرہ کا ذکر بھی شامل ہے اور ان کی شاعری کے نادر نمونے بھی شامل ہیں۔راجندر لال ہانڈا اپنی کتاب ''دلی جو ایک شہر تھا'' میں یوں بیان کرتے ہیں۔

> "اُردو ادب کا ذکر کئے بنا دلی کہ کہانی نامکمل ہی نہیں بلکہ بے رس ہے۔کیونکہ دلی ہی اُردو ادب کا گھر ہے۔اسی کی گود میں اس نے اپنا بچپن اور جوانی گزارے ہیں۔اگرچہ یہ ایک متنازعہ فی مسئلہ ہے لیکن پھر بھی اس قدر تو سب ہی تسلیم کرتے ہیں۔اُردو ادب کی ترقی اور بقا میں دلی کا خاص ہاتھ رہا ہے۔شاید ہی اُردو ادب کی کوئی ایسی تاریخ ہو جس میں دلی کو گہوارہ ادب نہ کہا گیا ہو۔"9

اس اقتباس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اُردو تاریخ میں دلی کو کیا اہمیت حاصل ہے اور انہی سب حالات کا بیان ناول ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' میں بھی شامل ہے۔اس ناول میں ہند اسلامی تہذیب کو مرکز بنایا گیا ہے اور اس کے تحت ہی تمام حالات کو تسلسل سے بیان کیا گیا ہے۔شمس الرحمن فاروقی جو کہ ایک بہترین محقق تھے انھوں نے تاریخ کا مطالعہ کر رکھا تھا۔اس لیے یہ ناول جو کہ متخیلہ ہے اس کو پڑھ کر یہ ظاہر نہیں ہوتا ہے کہ شمس الرحمن فاروقی اس عہد میں موجود نہ تھے بلکہ یہ آنکھوں دیکھے واقعات معلوم ہوتے ہیں۔

شمس الرحمن فارقی نے اس ناول میں جن حالات کو سمویا ہے یہ وہ حالات ہیں جب دو تہذیبوں کا ملاپ ہو رہا تھا ان حالات میں مشرقی تہذیب یعنی ہند اسلامی تہذیب کے آخری وقتوں کی چمک دھمک اور برگ و بار کا نقشہ، مغربی قوم کی ہندوستان آمد، ان کی محکوم قوم پہ حاکمیت، مغلیہ سلطنت کے آخری سالوں کے واقعات شامل ہیں۔اور یہ حالات ناول نگار نے اس خوبصورتی سے بیان کیے ہیں کہ انتظار حسین کا کہنا ہے کہ اس ناول کو زوال آمادہ مغلیہ سلطنیت کے آخری برسوں کی دستاویز کہا جا سکتا ہے۔ تاریخ کی کتابیں جو کہ عموماً دقیق اور خشک معلوم ہوتی ہیں مگر یہ ناول ایک ایسی کتاب ہے کہ اس کو پڑھنے کے ساتھ ساتھ قاری ناول کا لطف بھی لیتا ہے اور ساتھ ساتھ وہ تاریخ سے بھی واقفیت حاصل کر لیتا ہے۔ ان حالات کو جان کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ہماری تہذیبیں کس دور سے گزریں ہیں اور ان کو کن حالات کا سامنا رہا ہے۔ فاروقی صاحب نے اس ناول میں واقعات کو کچھ اس طرح سے بیان کیا ہے کہ ہمیں اس معاشرے کے ادب وآداب، وضع ولباس، رسم ورواج، جذبات واحساسات، عقائد وتوہمات سے بھی حالات کا اندازہ ہوتا ہے اور ناول کے پلاٹ کو یوں ترتیب دیا گیا ہے کہ قاری جیسے جیسے کہانی پڑھتا ہے تو اس کو کبھی کسی کردار سے انسیت ہو جاتی ہے، کبھی کسی کردار کو مظلوم جان کر اس سے ہمدردی محسوس ہوتی ہے اور کبھی کسی کردار سے نفرت محسوس ہوتی ہے یا یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ تاریخ کی کہانیاں یوں ہی بے رحم ہوتی ہیں کہ جن کو پڑھ کر قاری کو کسی سے انسیت تو کسی سے نفرت محسوس ہوتی ہے مگر یہ تاریخی کہانیاں کسی بھی زبان کا ایک قیمتی ثقافتی ورثہ ہیں۔

شمس الرحمن فاروقی نے یہ ناول اکیسویں صدی میں رہتے ہوئے اٹھارویں اور انیسویں صدی کے حالات کا لکھا ہے۔ گو کہ یہ ناول اکیسویں صدی میں لکھا گیا لیکن جب اس کی زبان اور حالات کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ ناول اسی زمانے کا کوئی قدیم ناول ہو لیکن اس کے ساتھ اُس دور کے حالات کو جاننا بھی ضروری ہے تا کہ آج کی نسل کو اس بات کا علم ہو سکے کہ ماضی میں ہند اسلامی تہذیب، ہندو مسلم اتحاد، مغلیہ خاندان کو کیسے حالات درپیش رہیں ہیں۔ ایسے ناول یا تاریخی کہانیاں ہمارا ثقافتی ورثہ ہیں جن کو کسی نازک آبگینے کی طرح سنبھال کر رکھنا چاہیے۔

زبان/منظر کشی

ناول نگاری کی صنف کا تقاضا ہے کہ اس صنف میں زبان کہانی کے شایانِ شان استعمال کی جائے۔ ناول نگار کے لیے لازم ہے کہ وہ ناول میں وہ زبان استعمال کرے جو روز مرہ کی اور عوامی بول چال سے تعلق رکھتی ہو کیونکہ قارئین میں وہ ناول ہی مقبول ہوتا ہے جس کی زبان قارئین کے لیے عام فہم ہو لہذا ناول نگار کو چاہیے کہ وہ سادہ،

برجستہ، سلاست اور روانی کے پہلوؤں کے ساتھ ساتھ ناول کی زبان کو فصیح و بلیغ رکھتے ہوئے استعمال کرے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر یحیٰی ابدالی کی کتاب "اُردو ناول کا تنقیدی جائزہ" سے اقتباس ہے۔

" زبان و بیان کو ناول نگار کا ذریعہ اظہار تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ وہ اپنے تجربات و محسوسات کو لفظیات کے ذریعہ پیش کرتا ہے اس کے پاس کوئی دوسرا ذریعہ اظہار نہیں ہوتا۔ الفاظ کو فنی اور جمالیاتی سطح پر برتنا پڑتا ہے جو ایک مشکل کام ہے۔ اس کے لیے مشق و ممارست کی ضرورت ہوتی ہے۔ الفاظ کا صحیح انتخاب اور اس کی تراش خراش کسی واقعہ کو دلکش، حسین، پر اثر اور دلنشین بناتا ہے۔ ناول نگار اس مرحلہ سے اسی وقت عہدہ برآ ہو سکتا ہے جب وہ انشا پردازی کا رمز شناس ہو۔"10

اس اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ ناول میں زبان کی کیا اہمیت ہے لہذا ناول میں ناول نگار کو ایسی زبان ہی استعمال کرنی چاہئے جو کہ عام فہم ہو اور قارئین کے لیے ابلاغ میں آسانی پیدا کرے کیونکہ کسی بھی ناول کی زبان جو کہ قارئین کے لیے فہم میں آسانی پیدا کرے اور ابلاغ میں واضح ہو بہترین سمجھی جاتی ہے۔ ۱۹۱۶ء میں ابلاغ کی ضد میں دادازم کی تحریک کا آغاز ہوا جس کو بعد میں ''ڈاڈا'' کے نام سے جانا گیا۔ اس تحریک کا حامیوں کا یہ کہنا ہے کہ

"فن ایک نجی چیز ہے یہ تخلیق کار کا ذاتی اظہار ہوتا ہے۔ فن جب کسی شخص کو مکمل طور پر سمجھ آجاتا ہے تو وہ صحیفہ بن جاتا ہے اور اگر فن قابلِ تفہیم ہو بھی تو ضروری ہے کہ قاری ذہنی طور پر بالغ ہو ورنہ ایسا فن جو آسانی سے سمجھ آجائے وہ فن نہیں صحیفہ ہوتا ہے۔"11

ادب میں وہ چیز جو ابلاغ میں نہ آسکے اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اسی وجہ سے اس تحریک کو بھی خاطر خواہ کوئی کامیابی نہ ہو سکی کیونکہ کوئی بھی سنجیدہ ادبی تخلیق کار اس طرف متوجہ نہ ہوا اور بالآخر ۱۹۲۴ء میں اس کا خاتمہ ہوا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ادب کی تخلیق میں ابلاغ کی کیا اہمیت ہے۔ لہذا ضروری ہے کہ ناول کی زبان استعمال کرتے ہوئے ابلاغ کو مدِ نظر رکھا جائے۔ اور یہ سارے نقاط ہمیں ناول ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' کی زبان میں نظر آتے ہیں۔ شمس الرحمن فاروقی نے اس ناول کی زبان کو ادبی لیکن عام فہم انداز میں استعمال کیا گیا ہے۔ اس ناول کی زبان کی بدولت ہی اس ناول کو ایک بہترین ناول قرار دیا گیا ہے۔ شمس الرحمن فاروقی صاحب نے اس پہلو کو بھی مدِ نظر رکھا کہ زبان کو ناول کی کہانی کے مطابق استعمال کیا۔ یہ اس لیے ضروری تھا کہ شمس الرحمن فاروقی نے تاریخی اعتبار سے جن ادوار یا واقعات کو شاملِ متن کا سوچا ان کا تقاضا تھا کہ ناول کی زبان ادبی ہو کیونکہ اگر ناول کی زبان میں ادبی چاشنی استعمال نہ کی جاتی تو شاید یہ ناول محض تاریخ کی ایک کتاب بن کر رہ جاتا۔ لہذا فاروقی صاحب نے وہ حالات و واقعات جن کو اس ناول

کے لیے منتخب کیا گیا تھا اگر وہ اس زبان میں بیان نہ ہوئے ہوتے جس انداز میں فاروقی صاحب نے اپنے ناول میں بیان کیے ہیں تو شاید وہ عام فہم بھی نہ ہوتے اور یہ ناول بھی محض ایک خشک کتاب بن کر رہ جاتا، مگر ناول نگار نے ان حالات وواقعات میں وہ ادبی چاشنی گھولی ہے کہ ہنداسلامی تہذیب آنکھوں کے سامنے چلتی پھرتی نظر آتی ہے۔اسی طرح یہ ناول جو کہ تاریخی صف میں کھڑا ملتا ہے اس کی زبان سے واضح مثال موجود ہے۔ناول ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' سے اقتباس ہے۔

"شہر کے جن علاقوں پر بادشاہ کا براہ راست تسلط تھا وہاں اور خاص کر فتحپوری کی جامع مسجد سے لے کر حویلی تک چاندنی چوک میں اور علی مردان خاں کی نہر کے کنارے کنارے دونوں طرف روشنی کا انتظام تھا۔ وہ پہاڑ گنج سے نکل کر ترکمان دروازے کی طرف جانے کی بجائے ذرا لمبے راستے سے ہو کر اور کچھ چکر کھا کر فتحپوری کی جامع مسجد کے پیچھے نکلے۔وہاں سے راستہ آسان تھا لیکن شمس الدین احمد کی سواری کا جلوس سر کی والاں میں وزیر کے دروازے تک ساتھ گیا۔"12

اس اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ ناول کی زبان کیسی ہے۔ناول کی زبان عام فہم ہے جو کہ ادبی چاشنی کے ساتھ ساتھ تاریخی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ناول میں کسی عام سے واقعے کو بھی خاص بنا کر پیش کیا گیا ہے کیونکہ ناول نگار نے الفاظ کا انتخاب ہی ایسا کیا ہے کہ قاری کے لیے ایک عام سا واقعہ بھی بہت اہمیت رکھتا ہے۔ناول میں زبان ہی وہ واحد رستہ ہے جس کے ذریعے ناول نگار اپنی بات دوسروں تک پہنچا سکتا ہے اور اس ناول میں زبان سلیس ہونے کے ساتھ ساتھ عام فہم بھی ہے لہذا وہ مقصد جو کہ ناول نگار کے ذہن میں ناول تخلیق کرتے وقت تھا وہ احسن طریقے سے قارئین تک پہنچتا ہے۔لہذا یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ ناول کی زبان میں ابلاغ موجود ہے۔

اگر ناول میں منظر کشی کے حوالے سے دیکھا جائے تو یہ ناول اس لحاظ سے ایک عمدہ مثال ہے کیونکہ کامیاب منظر نگاری کسی بھی صنف میں جان ڈالتی ہے۔منظر نگاری ایسی ہونی چاہیے کہ قاری کو کردار اپنے سامنے چلتے پھرتے اور واقعات ذہن میں فلم کی مانند دوڑتے نظر آئیں۔یہی اوصاف ناول کی بہترین منظر کشی کی بدولت ناول کو قارئین کی نظر میں بہترین بناتے ہیں۔سہیل بخاری اپنی تصنیف ''اُردو ناول نگاری'' میں منظر کشی کو یوں بیان کرتے ہیں۔

"کامیابی کا راز اس میں مضمر ہے کہ جو منظر پیش کیا جائے اس کی تصویر آنکھوں کے سامنے کھینچ جائے۔عام طور سے منظر نگاری بجائے خود کوئی اہمیت اور معنی نہیں رکھتی بلکہ اس کی مدد سے کرداروں کی فطرت اور سیرت کے مختلف گوشوں کے بے نقاب کیا جاتا ہے۔چنانچہ مناظر کو

واقعات و افراد سے ایک لازمی نسبت اور ایک ایسا تعلق ہونا چاہیے جس سے وہ افراد سے ایک لازمی زندگی کو برابر متاثر کرتے رہیں۔"13

اس اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ منظر نگاری کیا ہے اور ناول میں اس کی کیا اہمیت ہے۔ ناول کے اجزائے ترکیبی میں سے منظر نگاری ایک ایسا فن ہے جو بظاہر نظر نہیں آتا لیکن یہ ناول کے ہر حصے میں موجود ہوتا ہے اور اسی کی بدولت قارئین کی توجہ مزید بڑھتی ہے۔ ناول ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' میں بھی ناول نگار نے منظر نگاری کو یوں سمویا ہے کہ اس ناول کے ایک ایک واقعے سے منظر نگاری کی جھلک نظر آتی ہے۔ چاہے وہ واقعہ گھریلو زندگی سے تعلق رکھتا ہو، چاہے درباری احوال بیان ہو رہا ہو، چاہے کسی نشست کا ذکر ہو وغیرہ، ہر واقعے سے منظر کشی کا عمدہ ثبوت ملتا ہے۔ شاید اسی منظر نگاری کی بدولت ہی اس ناول کو پڑھ کر قاری یہ سوچتا ہے کہ جیسے وہ اٹھارویں، انیسویں صدی میں سانس لے رہا ہو۔ کسی ناول میں عمدہ منظر نگاری نہ صرف ناول کی مقبولیت کا باعث بنتی ہے بلکہ وہ اس بات کہ غمازی بھی کرتی ہے کہ ناول نگار کو اس صنف پر کس قدر عبور حاصل ہے اور یہ ناول پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ واقعی شمس الرحمن فاروقی صاحب جو کہ ابتدا میں بحثیت نقاد، محقق کے جلوہ افروز ہوئے وہ اس صنف میں بھی ملکہ رکھتے تھے اور اس ناول کے تمام اجزائے ترکیبی اس بات کا منھ بولتا ثبوت ہیں۔ اس ناول کے کرداروں اور واقعات میں منظر نگاری اسی طرح کی گئی ہے کہ قاری کو کردار کا غائبانہ تعارف رہتا ہے یعنی وہ کس قد کاٹھ کا ہے، اس کا رہن سہن کیسا ہے، اس کا اندازِ گفتگو وغیرہ قاری کردار سے متعلق ان تمام باتوں سے واقفیت رکھتا ہے، اور اگر کسی واقعے کو بیان کیا جا رہا ہے تو اس کو پڑھتے ہوئے قاری کو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا وہ خود اس محفل/نشست کا حصہ ہو۔ یہ سب جزئیات کمال منظر نگاری کا حصہ ہیں۔ ناول سے منظر نگاری کی ایک مثال درج ذیل ہے۔

"دوپٹہ اس کے سر پر ایک عجب اندازِ بے پروائی سے پڑا ہوا تھا کہ اس کے نیچے سے اس کی زلفوں ، چوٹی اور موباف میں پروئے ہوئے موتی صاف نمایاں تھے۔ ماتھے پر جڑاؤ چاند جس میں لہسینا، گلابی یاقوت، موتی اور نیلم جڑے ہوئے تھے۔ بہت بڑی بڑی، متبسم سخن گو آنکھوں میں کاجل کی بہت ہلکی لکیر، کانوں میں لمبے لمبے آویزے جن میں ہیرے اور نیلم جگمگا رہے تھے۔ ناک میں موتی اور زمرد جڑی ہوئی بھاری کیل، گلے میں سرخ یاقوت کا جگنو، اس کے نیچے سچے موتیوں کا ست لڑا ہار، کلائیوں میں بھر واں گھڑیالی کڑے اور ان کے دونوں طرف کانچ کی مہین چوڑیاں جن پر سنہرا کام تھا۔ پاؤں میں پازیب اور زری کی جوتیاں جن میں دیوار نہ تھی اور اوپری حصہ اتنا مختصر تھا کہ پاؤں کی نگار صاف جھلکتی تھی۔"14

اس اقتباس میں وزیر خانم کی سج دھج کو بیان کیا جارہا ہے اور یہ بناؤ سنگھار یزیڈنٹ بہادر کی کوٹھی پر ادبی نشت کی بدولت تھا۔اس واقعہ میں ناول نگار نے ایسے منظر نگاری کی ہے کہ قاری کو یہ حالات پڑھ کر ذہن میں وزیر خانم کے کردار کا ایسا نقشہ گھومتا ہے جیسے قاری نے حقیقت میں وزیر خانم کو دیکھ رکھا ہو۔ مختصراً یہ کہ اس ناول میں زبان اور منظر نگاری کی عمدہ اور ادبی پیمانے پر برتا گیا ہے۔ جس کی بدولت ہمیں یہ ناول مقبولیت کے آسمان پر نمایاں نظر آتا ہے۔

ب۔ متوازیات

(i)- پیش کاری

ناول ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' میں پیش کاری کے حوالے سے ایک خاص ترتیب کا خیال رکھا گیا ہے۔ عموماً ناولوں میں زیادہ ابواب بندی نہیں کی جاتی مگر اس کے برعکس اس ناول میں ۴۲ ابواب موجود ہیں اور یہ ابواب ترتیب کے ساتھ درج ہیں یعنی وہ ترتیب جس کے تحت کہانی آگے بڑھتی ہے اسی کے مطابق واقعات کو ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔اس ناول کی کہانی کا آغاز مخصوص اللہ نامی کردار کے نام سے ہوتا ہے جو کہ وزیر خانم کے والد کے پردادا تھے۔اُن کی کہانی کا آغاز کشمیر جیسی سرزمین سے ہوتا ہے اور سفر کے تمام احوال کا بیان شامل ہے کہ وہ کشمیر سے دہلی تک کیسے پہنچے اس ضمن میں تین نسلوں کی کہانی بیان ہوتی ہے اور اس کے بعد وزیر خانم کی زندگی کا حال بیان ہو رہا ہے ان کی زندگی میں آنے والے چار مرد اور نشیب و فراز کو کہانی کا حصہ بنایا گیا ہے۔ یہ کہانی چونکہ چار سے پانچ نسلوں پر مشتمل ہے لہذا اس میں تاریخی حقائق بھی در آتے ہیں اور اس ناول میں فکشن کے ساتھ ساتھ تاریخ بھی چلتی ہے۔ ناول نگار نے ایسے احسن طریقے سے ترتیب کو ملحوظِ خاطر رکھا ہے کہ کہیں پہ بھی خلاء نظر نہیں آتا۔ تمام واقعات کڑیوں کی صورت میں باہم پیوستہ ہیں۔

اس ناول کی ترتیب بلاشبہ ناول کی کہانی کو دلچسپ بناتی ہے۔اس ناول میں واقعات کی ترتیب کے لحاظ سے زمان و مکاں کو مدِ نظر رکھا گیا ہے۔ یہ ناول چونکہ الگ اور نمایاں قسم کا ناول ہے اور اس ناول کے الگ ہونے کی وجہ ایسی کہانی کا انتخاب ہے جو رومانوی، تاریخی ہونے کے ساتھ ساتھ ادبی بھی ہے اور اس ناول کے نمایاں ہونے کہ وجہ ادبی اور تاریخی کہانی کی ترتیب اور بیان ہے جو اسے مزید دلکش بناتی ہے۔ محمد حمید شاہد اس ناول کے متعلق کہتے ہیں کہ کہنے کو بس اتنی سی کہانی ہے کہ اگر یہ شمس الرحمن فاروقی صاحب کے ہاتھ نہ لگتی تو کوئی لے اُڑتا مگر جس طرح فاروقی صاحب نے اس ناول کی کہانی کو ہند اسلامی تہذیب سے جوڑا ہے شاید اس طرح کوئی اور بیان کی قدرت نہ رکھتا۔ بلاشبہ فاروقی صاحب نے اس ناول کی کہانی کو ایک الگ انداز سے بیان کر کے چار چاند لگا دیے ہیں۔ ناول کی کہانی جو کہ ۴۲ ابواب پر

مشتمل ہے۔ان ابواب میں سے چند کا بیان شامل ہے جس سے اس ناول کی ترتیب اور واقعات کی ترتیب کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

مارسٹن بلیک

بی بی

مندر

بھائی بہن

چھوٹی بیگم

ولیم فریزر

فینی پارکس

مرزاغالب

ناول کے باب بائیس سے باب انتیس کی ترتیب یوں ہے۔اس ترتیب سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ پیش کاری کے ضمن میں حالات و واقعات کو کس طرح ترتیب سے بیان کیا گیا ہے۔وزیر خانم کی زندگی میں پہلا مرد مارسٹن بلیک آیا پھر جس طرح وہ مندر میں قتل ہوا،اس سے وزیر خانم کے دو بچے تھے،پھر جس طرح ولیم فریزر وزیر خانم پہ آنکھ جما کر بیٹھا اور کس طرح اس نے ایک ادبی نشت رکھوائی جس میں مرزاغالب کو بھی دعوت دی گئی تھی اور فینی پارکس کو بھی مدعو کیا تا کہ وہ اس تمام وقت میں وزیر خانم کو اکتاہٹ کا احساس نہ ہونے دے اور برابر ان کی دلجوئی کرتی رہیں۔ ان سب حالات و واقعات کو ناول میں اسی ترتیب کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔جس سے ادب اور تاریخ متوازی چلتے ہیں اور اس ناول کی ترتیب مزید دلچسپ ہوتی ہے۔اس ناول کی دلچسپی کی وجہ شاید ناول میں حالات و واقعات کی ترتیب بھی ہے۔ناول کے واقعات کا رُخ چونکہ تاریخ کی طرف بھی مڑتا ہے لہذا اس ناول کو پڑھتے وقت قاری میں بے چینی اور تجسس کا مادہ بھی در آتا ہے کہ اس واقعہ کے بعد کیا ہو گا۔مگر ناول کی ترتیب ساری گتھیوں کو سلجھاتی چلی جاتی ہے۔اس ناول میں چونکہ ناول نگار نے وقت کے دورانیے کو ایک سے دو صدیوں تک پھیلا رکھا گیا ہے تو اسی کے تحت ناول میں واقعات بھی لمبے لمبے چلتے ہیں۔عموماً یہ تصور پایا جاتا ہے کہ لمبے لمبے واقعات دلچسپی کے اثر کو زائل کر دیتے ہیں مگر اس ناول میں شاید ناول نگار کو ادبی تخلیق پر ملکہ حاصل تھا کہ ناول میں موجود لمبے لمبے واقعات بھی قارئین کی دلچسپی کو زائل نہیں کرتے۔

ناول میں چونکہ واقعات طویل ہیں تو عموماً ایسا ہوتا ہے کہ جب کوئی نیا واقعہ شروع ہوتا ہے تو پچھلی بات کا اثر ختم ہو جاتا ہے لیکن اس ناول میں ایسا نہیں ہے۔ بلاشبہ واقعات طویل ہیں مگر ناول کا پلاٹ ایسے مربوط ہے کہ کہیں بھی قاری کو اکتاہٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ قاری جب اس ناول کو مکمل ختم کر دیتا ہے تو اسے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے اس نے کوئی ایسی کتاب پڑھی ہو جس میں رومان اور تاریخ ساتھ ساتھ چل رہی ہو۔ جب کبھی بھی ناول ذہن میں آئے تو اس کے واقعات مخصوص اللہ نامی کردار سے لے کر وزیر خانم کے شاہی قلعے سے نکلنے تک یوں از بر ہوتے ہیں جیسے خود آنکھوں دیکھے واقعات ہوں۔ کسی بھی ناول کی پیش کاری میں یہ نقاط اہمیت کے حامل ہوتے ہیں کہ کیا ناول کی ترتیب کہانی کو دلچسپ بناتی ہے، ناول میں واقعات طویل ہیں یا مختصر، جب ناول میں کوئی نیا واقعہ آتا ہے تو کیا پچھلے واقعے کا اثر زائل ہو جاتا ہے؟ اگر ان نقاط کی روشنی میں ناول ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس ناول میں مواد کی ترتیب ناول کو مزید دلچسپ بناتی ہے اور ناول میں واقعات نہ تو بہت طویل ہیں اور نہ ہی اتنے مختصر کہ اصل بات بیان ہونے سے رہ جائے اور جب پچھلے واقعے کے بعد نیا واقعہ کہانی میں شامل ہوتا ہے تو کبھی بھی پچھلے واقعے کا اثر زائل نہیں ہوتا بلکہ واقعات ایک کڑی کی صورت میں باہم مربوط ہیں۔ پس اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ناول ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' پیش کاری کے حوالے سے ایک بہترین، عمدہ اور مستند ناول ہے۔ واقعی یہ ناول اُردو ادب میں بہترین ناولوں میں گنے جانے کے لائق ہے۔

(ii)- اسلوب

اُردو کی تمام اصناف میں اسلوب کو بنیادی مقام حاصل ہے۔ اسلوب جو کہ انگریزی لفظ style کے مترادف ہے اب یہ ایک باقاعدہ اصطلاح کے طور پر بھی جانا جاتا ہے۔ جس کو اسلوبیات کا نام دیا گیا ہے۔ جدید لسانیات میں اسلوبیات کی باقاعدہ قدر تعین کی گئی ہے۔ اسلوب سے مصنف کی ذہنی استطاعت، انفرادیت، عہد، اندازِ بیان، تخلیقی کارناموں کا پتہ لگایا جاتا ہے کیونکہ اسلوب سے مصنف کے یہ تمام اوصاف گواہی دیتے ہیں کہ قلم کار کا قلم اور ذہین کتنا زرخیز ہے۔ علی رفاد فتیحی کی کتاب "ساخت اور اسلوب" سے اقتباس ہے۔

> "اسلوب دراصل ادائے خیال اور اظہارِ جذبات کا ڈھنگ ہے، جب ہم کسی ادیب تا مصنف کے اسلوب سے بحث کرتے ہیں تو ہم اپنی توجہ محض ادب و فن کے چند مقررہ اور مانوس نکتوں کی جستجو تک محدود نہیں رکھتے بلکہ یہ دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اس تخلیق میں ادائے خیال اور اظہارِ جذبات میں کسی حد تک انفرادیت کو ترجیح دی گئی ہے اور فن کار کی انفرادیت کا رنگ کہاں

تک تخلیق میں نمایاں ہے اور اس کے زیر اثر ان میں کیا چھنوی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ فن کار جب اپنے مشاہدے اور مطالعہ کو یکسو اور منضبط کرتا ہے اور اپنے بکھرے ہوئے تاثرات کو ایک رشتے میں منسلک کرتا ہے اور انھیں لسانی شکل عطا کرتا ہے تو اسلوب پر غور کرنا نہایت ضروری ہے۔"15

اس اقتباس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اسلوب کو کس قدر اہمیت حاصل ہے۔ اسلوب کو صرف مصنف کی ذات تک محدود نہیں کیا رکھا جاتا بلکہ اس سے ہٹ کر فن پارے میں یہ تلاش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ادائے خیال اور اظہارِ جذبات میں کس حد تک انفرادیت ہے اور تخلیق میں انفرادیت کا رنگ کس حد تک نمایاں ہے۔ اس سے یہ بھی مراد لیا جاسکتا ہے کہ کوئی مصنف اپنے خیال کا اظہار موزوں الفاظ میں کیسے کرے کہ الفاظ سے اس کی جھلک نظر آئے۔ اسلوب کے حوالے سے بہت سی تعریفیں کی گئیں ہیں جن میں مغربی ادیبوں کی تعریفیں بھی شامل ہیں۔ اب تک اہلِ علم وادب نے اسلوب کی جتنی تعریفیں کی ہیں ان کے تحت اسلوب کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ ہر فن کار کا زبان کو استعمال کرنے کا اپنا مخصوص رویہ اور منفرد انداز ہوتا ہے جو اسے دوسروں سے ممتاز کرتا ہے اور یہاں مصنف کا اپنا ایک الگ نقطۂ نظر سامنے آتا ہے۔ اسی الگ نقطہ نظر کی بدولت جو انفرادیت اسلوب میں در آتی ہے وہی مصنف کی پہچان بنتی ہے۔ جب اسلوب مصنف کی پہچان بنتا ہے تو یہ اس کے لیے اتنا ہی ذاتی ہوتا ہے جیسے اس کی انگلیوں کے نشان، اور یہ اسی قدر مصنف کو عزیز ہوتا ہے۔

۲۔ اسلوب میں عام انسانی رویے بھی سما سکتے ہیں۔ اسلوب کی جتنی بھی تعریفیں کی گئی ہیں ان تمام میں سے یہ قسم زیادہ وسعت کی حامل ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلوب نہ صرف تحریر و تقریر اور لسانی رویے کا نام ہے بلکہ اس میں انسان کی بول چال، رہن سہن، چال ڈھال، وضع اور سج دھج وغیرہ کا انداز بھی شامل ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلوب کا داہرہ بہت وسیع ہے۔ اگر ہم صرف اندازِ تحریر سے اوپر اُٹھ کر دیکھیں تو ہمیں معلوم ہو گا کہ اسلوب میں کیا کیا نقاط سما سکتے ہیں۔

۳۔ اسلوب میں خیال اور زبان دونوں کو اہمیت حاصل ہے یعنی کوئی خیال فن پارے میں کیوں پیش کیا گیا ہے اس کا مقصد کیا ہے اور زبان کے تحت یہ دیکھا جاتا ہے کہ خیال کو زبان کے تحت کس طرح الفاظ کے پردے میں لپیٹ کر پیش کیا گیا ہے۔ یعنی اس سے مراد لیا جاسکتا ہے کہ کسی فن پارے میں کیا خیال پیش کیا گیا اور کس طرح پیش کیا گیا ہے۔

اسلوب کا ادب سے بہت گہرا رشتہ ہے۔ اگر اسلوب کے تحت ناول ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس ناول کا اسلوب عام فہم ہے چونکہ اس ناول میں تاریخ کے لحاظ سے وہ دورانیہ منتخب کیا گیا

ہے جب برصغیر پاک وہند میں عربی، فارسی وغیرہ کا استعمال عام تھا لہذا اس کے مطابق ناول کے اسلوب میں بھی اُردو کے علاوہ عربی اور فارسی الفاظ کا کثرت سے استعمال کیا گیا ہے۔ وہ قارئین جو اس ناول کو پڑھتے ہیں اور اُردو کے علاوہ دیگر زبانوں پر عبور نہیں رکھتے ان کے لیے بھی اس ناول کا اسلوب عام فہم ہے۔ کیونکہ مصنف نے اس ناول میں گو کہ عربی اور فارسی کو بھی استعمال کیا ہے لیکن وہ اس قدر عام فہم الفاظ ہیں کہ مطالعہ کرتے وقت شاید کسی قاری کے لیے بھی نامانوس ثابت نہ ہوں۔ اسلوب کے ضمن میں یہ نقطہ عموماً سامنے آتا ہے کہ اندازِ تحریر میں انفرادیت ہو۔ اگر اس کے تحت اس ناول کے اسلوب کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو گا کہ واقعی اس ناول کا اندازِ تحریر الگ اور منفرد خصوصیات کا حامل ہے۔ اُردو ادب میں آج تک جتنے ناول منظرِ عام پر آئے ہیں ان میں سے ناول ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' کا اسلوب اپنی الگ پہچان رکھتا ہے۔ اسلوب کے ضمن میں یہ بات بھی منظرِ عام پر آئی ہے کہ اسلوب سے مصنف کا عہد جھلکتا ہو۔ اگر اس کے تحت ناول کے اسلوب کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو گا اس ناول سے فاروقی صاحب کا عہد جھلکتا ہے۔ چونکہ فاروقی صاحب ہندوستان کے باشندے تھے۔ انہوں نے دہلی کے گلی کوچوں کا منظر دیکھ رکھا تھا۔ اسی وجہ سے ناول میں دہلوی تہذیب کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ اس کے علاوہ فاروقی صاحب خود محقق بھی تھے تو انہوں نے اس متخیلہ کہانی کو تحقیق کر کے ایک ایسی صورت میں پیش کیا جیسے ایک حقیقی واقعہ ہو۔ اس ناول کی کہانی میں حقیقت اس حد تک در آئی ہے کہ بہت سے ناقدین کا کہنا ہے کہ اس ناول کو مغلیہ عہد کے آخری برسوں کی دستاویز کہا جا سکتا ہے۔ یہ سب ناول کے منفرد اسلوب کی بدولت ہے۔

ناول میں عربی اور فارسی الفاظ کے علاوہ فارسی آمیز اور عربی آمیز تراکیب بھی شامل ہیں، یعنی ایسی تراکیب جن کا آدھا حصہ اُردو اور آدھا حصہ عربی یا فارسی پر مشتمل ہوتا ہے۔ ناول میں سے ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ ناول میں فارسی الفاظ کی مثالیں درج ذیل ہیں۔

کلاہ گوشہ دہقاں بہ آفتاب رسید

نہ جائے رفتن

پائے ماندن

امروز فردا میں باز دید

چشم زدن

پیر و مرشد

گل فروشیاں

دیدہ درائی

کنارہ می کردی

درانتظار رہمادام چیدنم بنگر

اسی طرح ناول میں کثیر تعداد میں فارسی الفاظ اور شاعری کا بیان شامل ہے۔ جس سے اسلوب میں مزید دلکشی در آتی ہے۔ اسی طرح ناول میں عربی الفاظ کا بیان بھی شامل ہے۔ ناول سے اس ضمن میں مثالیں درج ہیں۔

افلااکون عبداشکورا

الحمداللہ

اِنَّااللہِ وَاِنَّااِلَیہِ رَاجِعونَ

اذاحاق القضاءضاق الفضاء

یااللہُ یارحمنُ یارحیمُ

انافتحنالک فتحامبینا

لیس بین الموت والفراق فرق

البعرلایخاف من السرق

اقبالہاوادام اللہ ایامہا

مفصلاًومشرحاً

ناول میں گو کہ فارسی اور عربی کا استعمال کیا گیا ہے۔ مگر عام استعمال ہونے والے الفاظ کو ہی برتا گیا ہے تاکہ ابلاغ میں مسئلہ نہ ہو۔ اسی طرح ان زبانوں کا بیان ناول کے اسلوب کو مزید دلکشی وروانی عطا کرتا ہے۔

(iii)-مواد

ناول ''کئی چاند تھے سرِآسماں'' کا مواد ناول کی طرح ہی الگ اور منفرد انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ مواد کے نقطہ نظر سے اگر کرداروں پر نظر دوڑائی جائے تو معلوم ہو گا کہ ناول میں بے شمار کردار پائے جاتے ہیں یہاں تک کہ ہم ان کو مندرجہ ذیل چار حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

بنیادی کردار

ثانوی کردار

اضافی کردار

ضمنی کردار

بنیادی کردار میں مخصوص اللہ، محمد یوسف سادہ کار، اکبری بائی، بڑی بیگم، منجھلی بیگم، چھوٹی بیگم، مارسٹن بلیک، نواب شمس الدین احمد خاں، نواب مرزا داغ دہلوی، ولیم فریزر، آغا مرزا تراب علی، میرزا سلطان غلام فخر الدین وغیرہ کے نام آتے ہیں۔ ثانوی کرداروں میں مرزا غالب، حکیم احسن اللہ نواب یوسف علی خاں، پنڈت نند کشور وغیرہ کے نام ہیں۔ اضافی کرداروں میں امام بخش صہبائی، بائی جی، سلیمہ، نواب ضیاالدین احمد خاں، ذوق دہلوی، بھرمار و غیرہ کے کردار شامل ہیں۔ جبکہ ضمنی کرداروں میں یحیٰ بڈ گامی، فینی پارکس، حبیب النساء، راحت افزاء، افضل النسا، چمپابی بی، ٹامس مٹکاف، سکندر صاحب، امتہ الفاطمہ، زینت محل، صبح دولت وغیرہ کے کردار شامل ہیں۔ لیکن ان تمام کرداروں کو ان کے حالات و واقعات کے ساتھ یوں ناول میں ضم کیا گیا ہے کہ ناول جس میں کرداروں کا جنگل موجود ہے اس کو پڑھ کر یہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ کرداروں کی کثرت ہے بلکہ شمس الرحمن فاروقی صاحب نے کرداروں کو یوں ضم کیا ہے ہر کردار ایک الگ کہانی رکھتا ہے اور اگر ایک کردار بھی کم ہو جائے تو شاید ناول کی کہانی میں واضح خلا محسوس ہو گا۔ فاروقی صاحب نے ناول میں حقیقی کرداروں کو منتخب کیا ہے۔ اسی بدولت ناول کہ کہانی جو متخیلہ کہانی ہے مگر ناول کو پڑھتے وقت ایسا محسوس نہیں ہوتا بلکہ یہ ایک حقیقی واقعہ معلوم ہوتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ناول کے مواد میں کردار بہت چست اور حقیقی بنا پر منتخب کیے گے ہیں جو کہ مواد کو مزید جان بخشتے ہیں۔ ناول کے مواد پر اگر مزید غور کیا جائے تو معلوم ہو گا شمس الرحمن فاروقی صاحب نے محض کرداروں کو ہی احسن طریقے سے بیان نہیں کیا بلکہ ساتھ ساتھ مرقع نگاری کو بھی جان بخشی ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر انور سدید یوں رقمطراز ہیں۔

> "شمس الرحمن فاروقی کا ناول "کئی چاند تھے سرِ آسماں" بنیادی طور پر ایک ایسا ناول ہے جس کی تعمیر میں انیسویں صدی کے ہندوستان کے تہذیبی تناظر سے گراں قدر استفادہ کیا گیا ہے اور جس کے بیانیے میں اُس دور کی تاریخ کے حقیقی کرداروں کو افسانوی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس ناول کے یہ سب کردار اپنا ذاتی اور شخصی تاثر پیدا کرنے کے لیے مرقع نگاری کا تقاضا کرتے ہیں اور شمس الرحمن فاروقی نے ان تقاضوں کی تکمیل تمام تر خوبیوں سے کی ہے۔"16

اس اقتباس سے مزید اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ناول کے مواد میں کون کون سی خوبیاں پنہاں ہیں۔ اس ناول میں شمس الرحمن فاروقی نے محض کردار نگاری سے ہی کام نہیں لیا بلکہ ساتھ ساتھ مرقع نگاری کا حسین امتزاج پیش کیا

گیا ہے۔ جس کی بدولت ناول کا مواد اپنے اندر اجزائے ترکیبی کا وسیع ذخیرہ رکھتا ہے۔ کرداروں کے علاوہ اگر ناول کے مواد پر نظر دوڑائیں تو ضمنی واقعات بھی کثیر تعداد میں ملتے ہیں۔ فاروقی صاحب نے ناول کا کینوس چونکہ بہت وسیع رکھا ہے۔ اسی بدولت ناول میں مرکزی کردار کے علاوہ بھی بہت سے کردار نظر آتے ہیں اور وہ اپنے ساتھ اپنے واقعے بھی بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ شمس الرحمن فارقی کے اسلوب کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے ضمنی واقعات کو بھی اس طرح بیان کیا ہے کہ وہ ضمنی واقعات ہوتے ہوئے بھی کہیں نہ کہیں وزیر خانم کے کردار سے جڑے ہوئے ہیں۔ مثلاً مارسٹن بلیک کی وفات کے بعد وزیر خانم کا انگریزوں سے براہ راست کوئی تعلق نہ تھا مگر اس کے باوجود بھی ناول میں انگریزوں کا ذکر موجود ہے جو کہ ضمنی واقعات کے تحت آیا ہے۔ کہیں وہ وزیر خانم کی زندگی میں شامل ہونے والے دوسرے مرد نواب شمس الدین کی صورت میں، کہیں خود ان سے بات چیت کے سلسلے میں۔ اسی طرح وزیر خانم کی نوکرانی کا واقعہ اس کی بیٹی کا بیان، مہاکالی کے واقعات، ٹھگوں کے قصے، وزیر خانم کی بھانجی کے حالات کا ذکر جو کہ بعد میں ان کی بہو بنی، وغیرہ سب ضمنی واقعات ہیں مگر شمس الرحمن فاروقی نے اس کمال مہارت سے ان واقعات کو ناول میں سمویا ہے کہ گو کہ یہ ضمنی واقعات ہیں مگر گھوم پھر کر ان کا تعلق مرکزی کردار سے جا ملتا ہے۔ یہ ناول کے مواد کی ایک ایسی خوبی ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔ واقعات ناول کا ایک ضروری حصّہ ہیں جن کے بغیر ناول کو پایہ تکمیل تک نہیں پہنچایا جاسکتا لیکن شمس الرحمن فاروقی نے جس انداز سے ناول میں واقعات کو سمویا ہے وہ بے مثال ہے ۔ ناول کے مواد میں مرکزی واقعات تو اہم مقام رکھتے ہی ہیں مگر ضمنی واقعات کو بھی کسی صورت الگ نہیں کیا جاسکتا ہے۔ ناول میں موجود ضمنی واقعات ناول کی کہانی کو مزید دلچسپ بناتے ہیں اور ان ضمنی واقعات کی بدولت شمس الرحمن فاروقی صاحب نے ایسے حالات و واقعات پہ روشنی ڈالی ہے کہ جس سے ہند اسلامی تہذیب مکمل طور پر سامنے آتی ہے۔

ناول کے مواد میں اگر زبانوں کے حوالے سے دیکھا جائے تو اس ناول میں اُردو زبان کے علاوہ فارسی، عربی اور انگریزی زبان کے الفاظ کثیر تعداد میں استعمال ہوئے ہیں۔ عربی اور فارسی کی شمولیت کی وجہ یہ ہے کہ کیونکہ اس وقت برصغیر پاک وہند میں عربی اور فارسی کا غلبہ تھا اور فارسی تو سرکاری زبان بھی رہ چکی تھی۔ جب عرب کے لوگ یہاں اسلام پھیلانے کی غرض سے آئے تو اس صورت میں برصغیر پاک وہند میں عربی کا رواج بھی عام ہو گیا اور آہستہ آہستہ یہ دونوں زبانیں برصغیر پاک وہند کے عوام میں مقبول ہوتی گئیں یہاں تک کہ ان دونوں نے علم وادب میں بھی جگہ پائی۔ اسی بدولت ناول میں بھی کئی نمونے موجود ہیں۔ جب انگریز تجارت کی غرض سے یہاں آئے تو ان کی زبان انگریزی سے یہ خطہ ناواقف تھا مگر ان کے یہاں قیام کی بدولت انگریزی زبان سے یہ خطہ واقف ہوا اور اس زبان کو یہاں کے لوگوں نے سیکھا اور دلچسپی کی بدولت انگریزی کے الفاظ برصغیر پاک وہند میں عام بول چال میں استعمال بھی

ہونے لگے۔ناول سے وزیر خانم کے کردار کی زبان سے انگریزی زبان کے استعمال کی کوشش کے حوالے سے اقتباس ہے۔

"صاحب کی زبان "ام سورے" اسے بہت بھلا لگتا تھا، کبھی کبھی تو وہ جان بوجھ کر کوئی ایسی بات چھیڑتی جس کا اختتام صاحب کی ''ام سورے'' پر ہو۔ ادھر صاحب کو بی بی کی زبان سے انگریزی لفظوں کی ٹوٹی پھوٹی ادائیگی بھی بڑی پیاری لگتی تھی۔ وہ کرسمس کو ''کسمس'' کہتی، ''شیمپین'' کو ''سمپین'' بولتی اور '' پار سلی'' کو ''پتیر سلی'' کہتی۔"17

اس اقتباس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ برصغیر کے لوگ بھی انگریزی زبان سیکھنے کی طرف مائل تھے۔اسی طرح ناول میں جابجا انگریزی الفاظ کا استعمال نظر آتا ہے جو کہ ناول کو حقیقت کے مزید قریب لے جاتا ہے۔ناول کے مواد میں اُردو اور فارسی شاعری کا بیان بھی شامل ہے جو کہ ناول کے حسن میں مزید اضافہ کرتا ہے۔ناول سے فارسی شاعری کے بیان سے متعلق اقتباس ہے۔

"شیندہ ام کہ نہ بینی و نا امید نیم
نہ دیدن تو شنیدم شیندنم بنگر
د مید دانہ و بالید و آشیاں گہ شد
در انتظار ہما دام چید نم بنگر"18

یہ مرزا غالب کے فارسی اشعار ہیں جو کہ انھوں نے ریزیڈنٹ بہادر کی کوٹھی پر منعقدہ ادبی نشت میں پڑھے ۔یہ محفل ولیم فریزر نے منعقد کروائی تھی۔اس میں مرزا غالب کو بطور خاص مدعو کیا۔اسی محفل میں وزیر خانم بھی موجود تھی انھوں نے بھی مرزا غالب کو سنا اور داد دی کیونکہ اس محفل میں مرزا غالب نے جو اشعار پڑھے اس پر داد کے وہ مستحق تھے۔اسی طرح کے واقعات سے ناول میں موجود تاریخی حقائق کا بھی علم ہوتا ہے۔اسی طرح ناول میں اُردو شاعری کا بیان بھی شامل ہے۔ناول سے اس ضمن میں اقتباس ہے:

"رات آنا تیرا قیامت
آکے جانا تیرا قیامت
غمزہ عید سا بس اک لمحہ

ایسا آنا تیرا قیامت ہے "19

ناول میں موجود یہ اشعار داغ دہلوی جو کہ نواب مرزا کے نام سے جانے جاتے ہیں ان کے ہیں۔ منشی گھنشیام لال عاصی جو کہ شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔ انھوں نے مرزا داغ دہلوی کی شہرت کے قصے سن رکھے تھے اور ان سے ملنے کا اشتیاق تھا۔ ملنے پر انھوں نے منشی گھنشیام کی فرمائش پہ یہ اشعار پڑھے۔ ناول میں موجود دوسری زبانوں کا بیان اور شاعری کا استعمال ناول کے مواد میں مزید دلچسپی پیدا کرتا ہے۔ اس سے ناول کی کہانی مزید دلچسپ ہوتی ہے۔ ناول کے مواد کو کردار، ضمنی واقعات اور دیگر زبانوں کا بیان ناول کو مزید زرخیزی عطا کرتا ہے۔ بلاشبہ ان تمام نقاط کی موجودگی سے ناول کا مواد منفرد اور دلچسپ ہوتا ہے۔ شمس الرحمن فاروقی نے مواد کے ضمن میں ایک ایسی ڈگر کی راہ تلاشی ہے جو کہ شاید تمام قارئین کے لیے نئی ہے اور تمام ادیب اس ڈگر پر اپنے قلم کو دوڑانا چاہیں گے۔

۔ نوآبادیاتی پس منظر کی بین المتنی نسبت

ناول ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' میں انگریز قوم کا ذکر بھی شامل ہے اور اسی مناسبت سے انگریزی الفاظ بھی در آتے ہیں۔ ناول کی کہانی کا اگر تاریخی اعتبار سے جائزہ لیا جائے تو اُس وقت برصغیر پاک و ہند میں انگریز قوم ہندوستانیوں پر مسلط تھی اور اس کا جابجا اظہار ناول میں بھی ملتا ہے۔ اسی وقت نوآبادیاتی حکومت بھی قائم ہوئی۔ ناصر عباس نے اپنی کتاب "لسانیات اور تنقید" میں نوآبادیاتی صورتِ حال کا نقشہ یوں کھینچا ہے۔

> "نوآبادیاتی صورتِ حال فطری اور منطقی صورتِ حال نہیں ہے۔ یہ از خود کسی قابلِ فہم فطری قانون کے تحت رونما نہیں ہوتی۔ ہر چند اس کی رونمائی تاریخ کے ایک خاص لمحے میں ہوتی ہے، مگر تاریخ کا یہ لمحہ کسی الہامی حکم یا فطرتی طاقتوں کے اپنے قوانین کی ''پیداوار'' نہیں ہوتا۔ اسے ''پیدا'' کیا جاتا اور تشکیل دیا جاتا ہے۔ چوں کہ ''پیدا'' کیا جاتا ہے، اس لیے مخصوص مقاصد کے حصول کو سامنے رکھا جاتا ہے، لہذا کہا جا سکتا ہے کہ یہ انسانوں کے مخصوص گروہ کے ہاتھوں مخصوص مقاصد کی خاطر برپا ہونے والی صورتِ حال ہے۔ اس گروہ کو نوآبادکار نام دیا گیا ہے۔"20

اس اقتباس کی روشنی سے مزید اندازہ ہوتا ہے کہ ناول میں جیسے حالات بیان کئے گے ہیں وہ سب فطری نہیں ہیں۔ بلکہ پیدا کئے گے ہیں۔ اُردو ادب میں نوآبادیاتی نظام کو ۱۸۵۷ء سے لاگو کیا جاتا ہے مگر اس سے قبل نو

آبادیاتی نظام کا پس منظر یا جھلکیاں اس ناول میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ نوآبادیاتی نظام کے آنے کے بعد اس کو تین اقسام میں تقسیم کیا جاتا ہے، انجذاب، امتزاج، بغاوت۔ اگر ناول کے کرداروں کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو گا کہ ناول میں کئی ایسے کردار ہیں جو کہ انجذاب، بغاوت، امتزاج سے تعلق رکھتے ہیں مثلاً وزیر خانم کا کردار امتزاج سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ انگریزی زبان سیکھنے کی طرف مائل تھیں لیکن کچھ عادات ان کو انگریزوں کی پسند نہ تھیں جیسے باسی اور غیر ذبیحہ گوشت کھانا، سرے عام شراب پینا، چینی کا استعمال وغیرہ۔ وزیر خانم کی یہ عادت امتزاج سے ملتی ہیں۔ جب کہ ناول کے کردار نواب شمس الدین کی طبیعت میں بغاوت تھی انگریزوں کے خلاف، وہ ان کی کسی بات کو اچھا نہ سمجھتے تھے بلکہ ان کے دل میں انگریز قوم کے لیے شروع سے بیر تھا اور یہی بیر بغاوت کا اعلان کرتا ہے۔ اسی بغاوت کے نتیجے میں نواب شمس الدین نوآبادکاروں کی سازش میں پھنس گئے اور لقمہ اجل بنے۔ گو کہ اس ناول میں نوآبادیاتی نظام کا پس منظر بیان کیا گیا ہے مگر یہ مناظر بھی خطرناک ہیں۔ جس طرح انگریز قوم یہاں آئی اور اپنے قدم جمائے یہ ایک نہایت پر درد کہانی ہے ۔ جیسے ناول میں انگریزوں کے حالات کا تذکرہ ہے اسی طرح ان کی زبان کا بیان بھی شامل ہے۔ ناول میں وہ الفاظ / مکالمے جن سے نوآبادیاتی نظام کی واضح جھلکیاں ملتی ہیں درج ذیل ہیں۔

۱۔" لیکن وہ کبھی کبھی چڑ چڑا ہو کر وزیر سے یہ بھی کہہ گزرتا کہ تم ہندوستانی ہوتے بڑے چور ہو اور بے ایمان ہو۔"21

۲۔"سوچنا کیا ہے؟ یہ سب حرام کے جنے ہندوستانی ہوتے ہی ایسے ہوں گے۔"22

۳۔"دیسی ریاستوں"23

۴۔"تمہارے پاس ہے ہی کیا جو بچے پالو گی اور تس پر یہ کہ اکیلی بھی رہو گی اور اگر دوسرے کا ہاتھ پکڑ لیا۔۔۔۔۔"24

۵۔ "Native chieftain"25"

۶۔"Good Evening , Sir"26

۷۔"Don’t worry . I’ll break this evil negro’s sprits, not his bones"27.

۸۔"Be assured, Fraser. It’ll be my task to bring that half- caste dog of a nabob to the gallows. "28

۹۔"That’s indeed a fine set of suggestion, caption skinner. Quite like eating one’s cake and having it too."29

۱۰۔"Master and Servant Theory"30

یہ تمام مثالیں ناول میں موجود انگریز کرداروں کے جملے ہیں جن سے نو آبادیاتی پس منظر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔انگریزی جملے تو کیا اُردو میں کہے گے مکالموں سے بھی نوآبادیاتی منظر کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ انگریزوں کے جملوں میں بھی کس طرح مسلمانوں کے لیے حقارت آمیز رویہ ہے۔ پہلی اور دوسری مثال میں مارسٹن بلیک وزیر خانم سے مخاطب ہے اور ہندوستانیوں سے متعلق گفتگو کر رہا ہے۔ جس میں وہ ہندوستانیوں کو چور، بے ایمان اور حرام کے جنے بول رہا ہے۔ تیسری مثال میں دیسی ریاستوں کا لفظ ہندوستان کی ریاستوں کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔انگریز اپنی حقارت کا اظہار کرتے ہوئے دیسی ریاستوں کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ چوتھی مثال میں مارسٹن بلیک کی وفات کے بعد اس کی پھوپی زاد بہن بھائی وزیر خانم سے اس کے دونوں بچوں کو چھین لے گئے کہ وزیر خانم کے پاس ان کے بچے اچھی طرح نہیں پل سکتے اور نہ ہی ان کی پرورش اچھی طرح ہو سکتی ہے، اس سے بھی انگریزوں کی طاقت کا راج بولتا ہے۔ پانچویں مثال میں دیسی رئیس کا لفظ نواب شمس الدین احمد کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔اور انگریزوں کے نزدیک یہ لفظ حقارت آمیز تھا۔ چھٹی مثال میں good evening , sir کے الفاظ ولیم فریزر کی زبان سے ادا ہو رہے ہیں یہ الفاظ وہ تمام لوگوں یعنی انگریزوں اور ہندوستانیوں کو دیکھ کر بولتا ہے۔ مگر باقاعدہ اپنی ٹوپی اتار کر تعظیم دینا صرف انگریزوں تک محدود تھا۔ کسی بھی ہندوستانی کے لیے وہ ایسا نہ کرتا، بلکہ صرف الفاظ ہی بولتا۔اس سے نوآبادیاتی مناظر کی جھلک واضح ہے کہ انگریز محکوم قوم کو کتنا حقارت آمیز سمجھتے تھے۔ ساتویں مثال میں سائمن فریزر اور لارنس کے درمیان گفتگو ہو رہی ہے جس میں وہ ولیم فریزر کے قتل میں نواب شمس الدین احمد کو پھسانا چاہتے ہیں اور نواب شمس الدین کے نوکر کریم خان کو گرفتار کر کے اس پر جسمانی تشدد کر کے زبردستی اس کی گوائی حاصل کرنا چاہتے تاکہ نواب شمس کا جرم ظاہر کر سکیں۔اس مثال میں بھی نوآبادیاتی جھلکیاں ہیں کہ ولیم فریزر جس کا قتل نامعلوم افراد نے کیا چونکہ اس کی اور نواب شمس کی آپس میں نہیں بنتی تھی اور نواب شمس الدین انگریزوں کو کھٹکتے تھے لہذا وہ اس الزام کے تحت ان کو مروانا چاہتے تھے۔آٹھویں مثال میں بھی جان لارنس اور فریزر کے درمیان ہی گفتگو ہو رہی ہے۔ جس میں وہ نواب شمس الدین احمد کو پھانسی تک لانے کے منصوبے بنا رہے ہیں۔نویں مثال میں کیپٹن اسکنر اور مٹکاف ایک سازش رچا رہے ہیں کس کا حصہ نواب شمس الدین احمد بنناہے۔اس سازش کے تحت مٹکاف نواب شمس کو شہر کے باہر گرفتار کر لے اور یوں گرفتار کرئے کہ ان سے سارا اسلحہ لے لے اور ان کو بغیر ہتھکڑی کے ریزیڈ

نٹی میں لائے کیونکہ نواب شمس کو مٹکاف پر اعتبار تھا یوں وہ اس کے ساتھ آجاتے اور رعایا کو یہ لگتا کہ نواب شمس نے خود کو انگریزوں کے حوالے کر دیا ہے۔اسی فریب سے وہ گرفتار بھی ہو جاتے اور رعایا انگریزوں پر زیادہ غصہ بھی نہ کرتی تھی۔ دسویں مثال بھی نواب شمس الدین کے کردار سے متعلقہ ہے ، جس میں نواب شمس کو پھنسانے کے لیے Master and servant theory کا استعمال کیا گیا ہے اسکے تحت نواب شمس کے ملازم کریم خان کو ملزم ثابت کیا جاتا ہے اور پھر اس تھیوری کے تحت جو کہ انگریزوں کا قانون ہے کہ نوکر مالک کے حکم کے مطابق کام کرتا ہے۔ لہذا مالک نوکر کے اعمال کا ذمہ دار ہے۔اس کے تحت نواب شمس کو سزا دی جاتی۔ ناول میں اسی طرح کی مثالوں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انگریزوں نے نوآبادیات کے تحت کس طرح ہندوستانیوں پر حکومت کی۔اپنے مقاصد کے حصول کے لیے ہندوستانیوں کو لقمہ اجل بنایا۔ناول میں موجود ان مثالوں میں نوآبادیاتی نظام کی نشاندہی ہوتی ہے اور ان مثالوں میں نوآبادیات کا واضح عکس موجود ہے۔ جس سے ناول کے متن کے بین السطور نوآبادیاتی پس منظر کی عکاسی ہوتی ہے۔

حوالہ جات:

۱۔ https://www.mukaalma.com/2457//

۲۔ علی عباس حسینی، اردو ناول کی تاریخ اور تنقید، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۸۷ء، ص ۶۱

۳۔ شمس الرحمن فاروقی، افسانے کی حمایت میں، مکتبہ جامعہ نئی دہلی لیمیٹڈ، مارچ ۲۰۰۶ء، ص ۶۷

۴۔ گوپی چند نارنگ، ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۱۰ء، ص ۶۰

۵۔ شمس الرحمن فاروقی، کئی چاند تھے سر آسماں، بک کارنر جہلم، پاکستان، ۲۰۲۱ء جنوری، ص ۱۶۹

۶۔ ایضاً، ص، ۳۰2

۷۔ ایضاً، ص، ۳۸۷

۸۔ ایضاً، ص، ۱۷۸

۹۔ راجندر لال ہانڈا، دلی جو ایک شہر تھا، مکتبہ جامعہ لیمیٹڈ، نئی دہلی، ۲۰۱۱ء، ص، ۱۴۱

۱۰۔ یحییٰ ابدالی، اردو ناول کا تنقیدی جائزہ، نیو کوالیٹی آفیسٹ پریس، شاہ گنج، پٹنہ، ۲۰۱۰ء، ص ۵۵ تا ۵۶

۱۱۔ https://www.girdopesh.com/dodisam_art_movement

۱۲۔ شمس الرحمن فاروقی، کئی چاند تھے سرِ آسماں، بک کارنر جہلم، پاکستان، ۲۰۲۱ء، ص ۲۳۷

۱۳۔ سہیل بخاری، اردو ناول نگاری، الحمرا پبلیشرز، دہلی، جولائی ۱۹۷۲ء، ص۶۹

۱۴۔ شمس الرحمن فاروقی، کئی چاند تھے سرِ آسماں، بک کارنر جہلم، پاکستان، ۲۰۲۱ء، ص۲۱۹

۱۵۔ علی رفاد فتیحی، ساخت اور اسلوب: نظریہ اور تجزیہ، بک کارپوریشن دہلی، ۲۰۱۶ء، ص۱۳۱تا۱۳۲

۱۶۔ سہ ماہی روشنائی، نثری دائرہ پاکستان، کراچی، جلد: ۱۳، شمارہ: ۵۵۰، جولائی تا ستمبر ۲۰۱۲ء، ص۴۸

۱۷۔ شمس الرحمن فاروقی، کئی چاند تھے سرِ آسماں، بک کارنر جہلم، پاکستان، ۲۰۲۱ء، ص۱۷۸

۱۸۔ ایضاً، ص۲۳۳

۱۹۔ ایضاً، ص۵۹۸

۲۰۔ ناصر عباس نیر، لسانیات اور تنقید، یورپ اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء، ص۲۳

21۔ شمس الرحمٰن فاروقی، کئی چاند تھے سرِ آسماں، ایضاً، ص178

22۔ ایضاً، ص178

23۔ ایضاً، ص192

24۔ ایضاً، ص203

25۔ ایضاً، ص225

26۔ ایضاً، ص347

27۔ ایضاً، ص441

28۔ ایضاً، ص451

29۔ ایضاً، ص471

30۔ ایضاً، ص476